مشاجرات صحابہ کرام

کے بارے میں فکری لغزشیں اور ان کا علمی تعاقب

از

پروفیسر ظفر احمد صاحب

سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج صادق آباد

سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر S.E. کالج بہاولپور

ترتیب وتدوین: ڈاکٹر مسعود احمد

فہرست

(پہلی قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشاجرات صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین) کے متعلق اخی المکرم جناب پروفیسر ظفر احمد صاحب کی ایک تحریر کے چند نکات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ہمارا مقصد کسی کی ہرگز دل آزاری نہیں ہے بلکہ اتحاد بین المسلمین کی خاطر فکری لغزشوں کے علمی تعاقب کی طرف صحیح رہنمائی مقصود ہے۔

قرآن کریم کی رو سے صحابہ کرام (مہاجرین وانصار اور فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے مولفتہ القلوب) کی حسن عاقبت یقینی اور قطعی ہے۔ اس کے برعکس بعد کے لوگوں میں سے کسی کی بھی حسن عاقبت کا یقینی اور قطعی علم صرف اللہ تعالی کو ہے۔ لہٰذا مخلوق کے علم کے اعتبار سے صحابہ کرام معلوم العاقبہ اور بعد والے سب کے سب مجہول العاقبہ ہیں۔ مجہول العاقبہ حضرات کو عقلا و نقلا ہرگز (پھر دہرایئے ہرگز) یہ حق حاصل نہیں کہ وہ معلوم العاقبہ صحابہ کرام کے مشاجرات میں حکم (فیصل) بن کر کسی کو باغی، مخطی وغیرہ وغیرہ قرار دیں۔ یہاں سکوت اور توقف واجب ہے۔ جن غیر اصحابی حضرات سے اس سلسلے میں خطائے اجتہادی سرزد ہوئی ہے ان کا ذہن اس اہم نکتہ کی طرف منتقل نہیں ہوا۔ متاخرین کے برعکس متقدمین اکابر حضرات سکوت و توقف کے ہی قائل تھے۔ مثلاملا علی قاری کی شرح الفقہ الاکبر (ص 102) میں ہے۔؛

سئل احمد عن امر علی و عائشہ فقال تلک امتہ قد خلت لھا ما کسبت و لکم ما کسبتم ولا تسئلون عن ماکانوا یعملون۔

یعنی حضرت امام احمد بن حنبل سے حضرت علی اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہما) کے اختلافی معاملہ کے

متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے قرآن کی آیت پڑھ دی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی وہ اپنے اعمال کی ذمہ دار ہے اور تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو۔ پس تم سے ان کے کیئے کا نہیں پوچھا جائیگا۔

-اور مثلاً امام ذہبی رح نے سیر اعلام النبلاء (جلد 3 ص 142) میں لکھا ہے کہ ؛

قال الاوزاعی سئل رجل الحسن البصری عن علی و عثمان فقال کانت لہذا سابقتہ و لہذا سابقتہ و لہذا قرابتہ و لہذا قرابتہ و ابتلی ہذا و عوفی ہذا۔ فسئلہ عن علی و معاویہ فقال کانت لہذا قرابتہ و لہذا قرابتہ و لہذا سابقتہ و لیس لہذا سابقتہ و ابتلیا جمیعا۔

امام اوزاعی رح فرماتے ہیں کہ کسی نے حضرت حسن بصری رح سے حضرت علی و حضرت عثمان (رضی اللہ عنہما) کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا، انہیں بھی قبول اسلام میں سبقت حاصل ہے اور انہیں بھی۔ انہیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قریبی رشتہ داری کا شرف حاصل ہے اور انہیں بھی۔ حضرت علی (کرم اللہ وجہ) کو آزمائش سے دوچار ہونا پڑا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

(مظلومانہ شہادت کے بعد) عافیت پا گئے۔ اس نے پھر حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ انہیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت حاصل ہے اور انہیں بھی اور انہیں (حضرت علی رض کو) قبول اسلام میں سبقت حاصل ہے اور انہیں (حضرت معاویہ رض کو) نہیں۔ آزمائیش دونوں کو پیش آئی۔

اور مثلاً دمیری کی حیوۃ الحیوان (جلد 1 ص 350) میں ہے۔

و قد سئل عن علی و معاویہ (رضی اللہ عنہما) فقال (عمر بن عبدالعزیز) تلک دمآء طہر اللہ منھا سیوفنا افلا نطہر من الخوض فیہم السنتنا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رح سے حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کے متعلق پوچھا گیا تو

انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے ان خونوں میں ہماری تلواروں کو رنگین ہونے سے بچایا تو کیا اب ہمیں اپنی زبانوں کو ان معاملات کی چھان بین سے نہیں بچانا چاہئیے؟

اور مثلا علامہ ابن حجر مکی رح اپنی کتاب الخیرات الحسان (ص 57) میں امام ابو حنیفہ رحمتہ علیہ کے متعلق لکھتے ہیں؛ -

سئل عن علی و معاویہ و قتلی صفین فقال اخاف علی اللہ عن اقدم بشئ یسئلنی عنہ ولو سکت لم اسئل عنہ بل عن ما کلفت بہ فالاشتغال بہ اولی۔

حضرت امام ابو حنیفہ رح سے حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) اور جنگ صفین کے مقتولین کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں کہ اس معاملے میں کوئی ایسی بات کہہ دوں جس کے متعلق اللہ تعالی مجھ سے پوچھے اور اگر میں خاموش رہوں تو مجھ سے ان کے متعلق پوچھا نہیں جائیگا۔ مجھ سے صرف انہی ذمہ داریوں سے متعلق پوچھا جائیگا جن کا میں شرعا مکلّف اور پابند ہوں۔ لہذا مجھے اپنے انہی اعمال میں مشغول رہنا بہتر ہے۔

-اور مثلا شیخ عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب غنیتہ الطالبین (ص 140) میں لکھتے ہیں؛

نسلم امرہم الی اللہ عزوجل علی ماکان وجری من اختلاف علی وطلحہ والزبیر وعائشہ ومعاویہ (رضی اللہ عنہم)۔

یعنی ہم اس اختلاف میں جو علی، طلحہ، زبیر، عائشہ اور معاویہ (رضی اللہ تعالی عنہم) کے درمیان پیش آیا تو ہم ان کے معاملے کو اللہ عزوجل کے سپرد کرتے ہیں۔

اور مثلا علامہ قرطبیؒ رح اپنی تفسیر الجامع لاحکام القرآن (ج 16 ص 322) میں حضرت حسن بصری رح کے متعلق لکھتے ہیں؛ -

قال شہدہ اصحاب محمد و نہینا و علموا و جہلنا و اجتمعوا فاتبعنا و اختنفوا فوقفنا۔

حضرت حسن بصری رح کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسا قتال تھا جس میں اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود تھے، ہم تو غیر حاضر تھے۔ انہیں حالات کا صحیح علم تھا، ہم تو بے خبر رہے۔ جس پر اصحاب متفق ہوئے تو ہم نے اس کی پیروی کی اور جس بات میں انہوں نے اختلاف کیا تو ہم نے توقف اختیار کیا۔

-اور مثلا یہی امام قرطبیؒ رح اپنی تفسیر (ج16 ص361) میں لکھتے ہیں ؛

لا یجوز ان ینسب الی احد من الصحابہ خطا مقطوع بہ اذ کانوا کلہم اجتہدوا فی ما فعلوہ وارادوا اللہ عزوجل وہم کہم لنا آئمہ وقد تعبدنا بالکف عن ما شجر بینہم۔

صحابہ کرام میں سے کسی کی طرف بھی یقین کے ساتھ خطا کو منسوب کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ سب نے اپنے طور پر اجتہاد سے کام لیا اور وہ اللہ کی رضا کا ارادہ رکھتے تھے اور وہ سب کے سب ہمارے پیشوا ہیں۔ ہم ان کے بارے میں اپنی زبان کو بند رکھنے میں ہی اللہ کی رضا خیال کرتے ہیں۔

-اور مثلا شرح عقیدہ طحاویہ میں ہے؛

وقعد عن القتال اکثر الاکابر..... یعنی اکابر صحابہ کرام کی اکثریت باہم خانہ جنگی میں شریک نہیں ہوئی۔

یہی بات اور متقدمین حضرات مثلا علامہ ابن کثیر رح نے بھی لکھی ہے کہ ان دنوں دسیوں ہزار صحابہ کرام زندہ موجود تھے لیکن بہت ہی کم حضرات نے ان جنگوں میں حصہ لیا

(دوسری قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزشتہ قسط میں مشاجرات صحابہ کے متعلق متقدمین کے موقف کی عبارات آپ نے ملاحظہ فرمائیں اور یہ کہ صحابہ کرام کی اکثریت نے ان محاربات میں حصہ نہیں لیا۔ اگر اس دور کے صحابہ کرام کی اکثریت قطعیت سے یہ فیصلہ نہ کرسکی کہ کون حق پر ہے اور کون باغی یا مخطی ہے تو بعد والے یہ فیصلہ کیسے کرسکتے ہیں؟ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ خطاء اور نسیان اپنی اصل کے اعتبار سے قابل مواخذہ نہ ہوتے تو اللہ تعالی ہمیں یہ دعا ہی کیوں سکھاتا؛۔ ربنالا تواخذ نا ان نسینا او اخطانا . . الآیہ . . یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالی خود ہی عدم مواخذہ کی دعا سکھائے پھر نسیان اور خطاء پر مواخذہ بھی فرمانے لگے۔ لیکن قتل خطاء اس سے ایک حد تک مستثنی ہے۔ اس پر آخرت میں مواخذہ نہ بھی ہو تو بھی دنیا میں مقتول کے ورثاء کو دیت دینا ہو گی۔ لگاتار دو ماہ کے روزے رکھنے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا یہ سمجھنا درست نہیں کہ صحابہ کرام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو باغی نہیں بلکہ خطائے اجتہادی پر سمجھتے تھے اور خطائے اجتہادی چونکہ معاف ہے اس لئے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینا ضروری نہ سمجھا۔

ایسی مبینہ خطاء صحابہ کرام کے لئے نظر انداز کئے جانے کے لائق نہیں ہو سکتی تھی جس میں مسلمانوں کے خون بہنے کے بھی قوی خدشات تھے۔ وہ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یقین قطعی کے ساتھ خطائے اجتہادی پر سمجھتے تو اتمام حجت کے لئے یقینا حضرت معاویہ پر ان کی غلطی کو خوب واضح کرتے۔ اگر وہ پھر بھی تسلیم نہ کرتے تو یقینا سورہ حجرات میں مذکور متعلقہ حکم کے تحت حضرت علی کرم اللہ وجہ کا بھرپور ساتھ دیتے اور گھروں میں نہ بیٹھے رہتے۔

اور مثلا بروایت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کسی شخص نے مولانا نعیم لکھنوی رح سے حضرت

علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کے متعلق پوچھا تو انھوں نے دریافت فرمایا کہ یہ سوال تمہارا ہے یا کسی اور کا؟ اس شخص نے کہا کہ فلاں حافظ صاحب نے پوچھا ہے۔ مولانا لکھنوی صاحب کے پوچھنے پر اس شخص نے بتایا کہ حافظ صاحب جوتے فروخت کرتے ہیں اور میں کپڑے رنگتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا کہ تم دونوں مطمئن رہو قیامت کے دن ان حضرات کا مقدمہ تم پر پیش نہیں ہوگا اس لئے تم کپڑے رنگتے رہو اور حافظ صاحب جوتے فروخت کرتے رہیں۔

مندرجہ بالا عبارات سے خوب واضح ہو رہا ہے کہ اکابر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی اکثریت نے ان جنگوں سے اجتناب کیا۔ اس کے بعد متقدمین اکابر امت مثلاً حضرت حسن بصری، حضرت عمر بن عبدالعزیز، امام ابو حنیفہ، امام احمد بن حنبل، شیخ عبدالقادر جیلانی اور علامہ قرطبیؒ (رحمہم اللہ تعالی) وغیرہ حضرات نے توقف اور سکوت اختیار کیا۔

علامہ قرطبیؒ رح نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان اختلافی امور میں یقین اور قطعیت کے ساتھ خطاء کو صحابہ کرام کی طرف منسوب کرنا سرے سے جائز ہی نہیں۔ تو بتایئے کہ ہمارے اکثر متاخرین کا یہ خیال کیسے درست ہوا کہ ان جنگوں میں حضرت علی (رضی اللہ عنہ) یقیناً حق پر اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) یقیناً خطاء پر تھے۔ بعض حضرات نے تو اس موقف پر اجماع امت تک کا بھی ناحق دعوی فرما دیا ہے۔ یہ ان حضرات کی خطائے اجتہادی ہے جس پر وہ ان شاء اللہ ماخوذ نہیں ہوں گے۔ لیکن خطاء بہر حال خطاء ہے۔ جب اس بات میں اختلاف پیدا ہو جائے کہ کوئی صحابی رسول خطاء اجتہادی پر ہے یا غیر اصحابی حضرات صحابی کی طرف خطائے اجتہادی کے انتساب میں خود خطائے اجتہادی پر ہیں؟ تو اس اختلاف میں اصول "اہون البلیتین" (lesser evil) کے تحت صحابی کی بجائے غیر صحابی کو خطائے اجتہادی پر قرار دینا ہی صحیح ہوگا۔ جب صحابی کی طرف خطائے اجتہادی منسوب کی جائے تو اس کا جواب یہ پیش کیا جاتا ہے کہ خطائے اجتہادی سرے سے قابل مواخذہ ہی نہیں بلکہ مجتہد کو اس کی غلطی پر بھی اکہرا اجر ملتا

ہے لہٰذا صحابی پر خطائے اجتہادی منسوب کرنے سے اس کی تنقیص نہیں ہوتی۔ پس اگر ہم غیر صحابی کی طرف خطائے اجتہادی منسوب کریں تو اس کی توہین بھی نہیں ہوتی۔ اور ادب کا تقاضا یہ بھی ہے کہ بعض ناگزیر صورتوں میں صحابی کی بجائے غیر صحابی کی طرف خطائے اجتہادی کو منسوب کیا جائے۔

یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے کہ اجتہادی اختلاف میں ہمیشہ صواب اور خطاء کا ہی اختلاف نہیں ہوا کرتا بلکہ یہ اختلاف اولی و خلاف اولی، احسن و حسن، افضل و مفضول اور راجح اور مرجوح کا بھی تو ہو سکتا ہے۔ اختلاف تنوع تو ایک طرف رہا بعض اوقات اختلاف تضاد میں بھی فریقین مصیب (حق بجانب) ہوتے ہیں۔ مثلاً غزوہ بنی نظیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر کچھ اصحاب نے تو یہودیوں کے کھجور کے درخت کاٹے اور کچھ نے نہیں کاٹے۔ دونوں کا عمل بالکل متضاد ہے لیکن فریقین اپنی اپنی جگہ پر حق بجانب تھے۔ مشاجرات صحابہ کرام میں محاکمہ سرے سے خلاف ادب ہے۔ کوئی اس کے بغیر نہ رہ سکے تو فریقین کو حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے یا اس سے نیچے اترتے ہوئے اسے اولی و خلاف اولی کا اختلاف سمجھا جا سکتا ہے۔ دیکھئیے نماز میں رفع یدین و عدم رفع یدین وغیرہ بیشتر فروعی اختلافات میں فقہی مسائل کی ناگزیر تحقیق کے پیش نظر ہم اولی اور خلاف اولی سے آگے نہیں بڑھ سکتے یہاں کسی کو بھی خطائے اجتہادی پر سمجھنا صحیح نہیں۔ مشاجرات صحابہ کرام میں محاکمہ تو سراسر غیر ضروری ہے اور فقہی مسائل کے برعکس اس کی کوئی ناگزیر صورت سرے سے ہی نہیں پھر بھی محاکمے کا شوق بے چین کرے تو ہمیں فریقین کو مصیب (حق بجانب) سمجھنا چاہئیے یا پھر اولی اور خلاف اولی سے آگے نہیں بڑھنا چاہئیے۔ ورنہ امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل وغیرہ کی طرح سکوت اور توقف ہی بہتر ہے۔ ہم یہاں امام ابو حنیفہ رح کی اتباع چھوڑ کر متاخرین اکابر حضرات کی پیروی کو کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟

(تیسری قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم سمجھتے ہیں کہ سیدنا حضرت علی اور سیدنا حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) دونوں اپنی اپنی جگہ پر حق بجانب تھے جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ حدیث "اقضاہم علی" کے مصداق کامل تھے۔ بہترین قاضی ہمیشہ انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے اور انتظامی تقاضوں پر اس کی نظر نہیں ہوتی۔ قاتلین عثمان (رضی اللہ عنہ) کی شرعی شہادتوں کے مطابق صحیح تعیین نہایت دشوار تھی۔ کسی بڑے سے بڑے ملزم کو بھی شرعی فیصلے کے بغیر مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ محمد بن ابی بکر اور مالک بن اشتعر نخعی جیسے لوگوں کا جرم عدالتی تقاضوں کے مطابق ثابت نہیں ہو سکا تھا، اس لئے حضرت علی کرم اللہ وجہ نے انہیں اگر صوبوں پر عامل (گورنر) مقرر کیا تو وہ اپنی جگہ پر اس میں حق بجانب تھے۔ جہاں تک انتظامی تقاضوں کا تعلق ہے تو کسی مشتبہ شخص کو گھر کا چوکیدار مقرر کرنا بھی مناسب نہیں چہ جائیکہ اسے صوبے کا عامل بنادیا جائے۔ حضرت معاویہ بہترین منتظم تھے۔ بہترین قاضی بہترین منتظم نہیں ہوسکتا اور بہترین منتظم بہترین قاضی نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مہذب معاشروں میں عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ رکھنے پر زور دیا جاتا ہے۔ بہترین منتظم ہونے کی حیثیت سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی جگہ پر یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ جن لوگوں پر قتل عثمان کے قوی الزامات اور شبہات ہیں انہیں یوں عامل مقرر کیا جائے تو قاتلین عثمان سے قصاص لینا کیسے ممکن ہے؟ اگر حضرت علی کرم اللہ وجہ کو غلبہ حاصل ہوجاتا تو قاتلین عثمان (رضی اللہ عنہ) اور دیگر مفسدین میں سے کوئی ایک بھی کیفر کردار کو نہ پہنچ پاتا کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہ شرعی شہادتوں کے بغیر کسی کو مجرم قرار نہیں دے سکتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذہن سراسر انتظامی تھا اگر انہیں غلبہ

حاصل ہو جاتا تو آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا۔ کیونکہ وہ ہر مشکوک اور مشتبہ شخص پر یقینا ہاتھ ڈالتے۔ اللہ تعالی نے دونوں اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یوں بچایا کہ دونوں طرف کے مفسدین کی اپنی ہی اشتعال انگیزی سے بالآخر جنگ تک نوبت پہنچی کہ جس میں اکثریت انہی مفسدین کی کام آئی اور وہ اپنے کیفر کردار کو خود اپنے ہاتھوں سے پہنچ گئے۔ جو لوگ مخلص تھے ان میں سے بھی کچھ درجہ شہادت پر فائز ہوئے ہوں تو اس سے بالآخر دینی فائدہ ہی ہوا کہ ان کی شہادت مفسدین اور باغیوں کی بکثرت ہلاکت کا ذریعہ بنی۔ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) بہت ہی کم ان جنگوں میں شریک ہوئے۔ یہ جو شور مچایا جاتا ہے کہ ہزاروں صحابہ کرام ان جنگوں میں شہید ہو گئے تھے تو ایسا دعوی کرنے والے زیادہ نہیں تو ایک سو اصحاب ہی کی اصلی اور معتبر فہرست مہیا فرمائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مورد وحی اور معصوم عن الخطاء ہونے کی وجہ سے مدنی ریاست کے بیک وقت منتظم اعلی، قاضی اور فوج کے سربراہ تھے۔ بعض اوقات کسی مسئلے میں انتظامی اور عدالتی تقاضے باہم متصادم ہوتے ہیں۔ کبھی انتظامی اور کبھی عدالتی تقاضوں کو مقدم رکھنا ہوتا ہے مثلا حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے قتل کا مشورہ دیا جو انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق تھا لیکن انتظامی تقاضوں کے منافی تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ میں ایسا کروں تو مخالفین کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے اصحاب کو قتل کرتے ہیں۔ یہ خود ہی اپنے انجام کو پہنچے گا۔ بعد میں اس کی رسوائی سب پر خوب عیاں ہو گئی تو واضح ہوا کہ آپ کا اس کے متعلق رویہ بالکل مناسب تھا۔ اور مثلاً آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خواہش تھی کہ بیت اللہ کی عمارت اسی طرح بنائی جائے جیسے اسے حضرت ابراہیم اور ان کے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل (علیہما السلام) نے تعمیر کیا تھا۔ لیکن انتظامی تقاضوں کے پیش نظر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ (انصاف پر مبنی) اپنی اس خواہش کو پورا کروں تو تیری قوم نے ابھی ابھی اسلام قبول کیا ہے، انہیں

پریشانی ہو گی کہ یہ کیا ہو رہا ہے

حضرت علی کرم اللہ وجہ اقضاہم علی کا مصداق ہونے کی بناء پر ہر حال میں عدالتی تقاضوں کو ملحوظ رکھنے پر اپنی جبلت اور طبیعت کے اعتبار سے مجبور تھے۔آخر میں انہیں بھی احساس ہوا کہ انتظامی تقاضوں کو یکسر نظرانداز کرنے سے امن عامہ برقرار نہیں رہ سکتا، چنانچہ جنگ صفین سے واپسی پر آپ نے فرمایا۔ اے لوگو! تم معاویہ کی حکومت کو ناپسند مت کرو، کیونکہ اگر تم نے ان کو گم کر دیا تو دیکھوگے کہ سر اپنے شانوں سے ایسے کٹ کٹ کر گریں گے جیسے حنظل کا پھل اپنے درخت سے گرتا ہے۔(البدایہ والنہایہ ج8ص131)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی حیات طیبہ میں قصہ افک (حضرت عائشہ رض پر بہتان کا واقعہ) بظاہر ایک نہایت تکلیف دہ حادثہ تھا لیکن اللہ تعالی نے فرمایا؛-لاتحسبوہ شرالکم بل ہو خیر لکم (سورہ نور) یعنی تم اسے اپنے لئے برا خیال نہ کرو بلکہ یہ تمہارے لئے اچھا ہے... اسی طرح ہمیں مشاجرات صحابہ کرام میں مثبت پہلو کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ تفاضل انبیاء کا شرعی حکم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی بھی رسول یا نبی کی فضیلت ومنقبت اس انداز سے بیان نہ کی جائے کہ جس سے کسی دوسرے نبی کی توہین ہوتی ہو۔ تفاضل صحابہ میں بھی اسی اصول کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔آج اس پر فتن دور میں ایسا لٹریچر سامنے آرہا ہے کہ جس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حمایت اس انداز میں بیان کی گئی ہے کہ اس کے مطالعہ سے عام ناواقف لوگوں کے ذہن میں سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ناحق شبہات جنم لیتے ہیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہ کے حق میں اس انداز سے باتیں کی جاتی ہیں کہ اس سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف ناحق شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔

مشاجرات صحابہ کا موضوع نہایت نازک اور حساس ہے یہاں بڑے بڑے لوگوں کے قدم بھی ڈگمگانے لگتے ہیں۔ کیا یہاں متقدمین اکابر کا سکوت اور توقف ہی سلامتی کا بہترین راستہ نہیں؟؟ اگر کسی کو محاکمہ

کا شوق ہے تو تفاضل انبیاء کی طرح تفاضل صحابہ میں بھی شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔ آج امامیہ حضرات کی اسمآء الرجال کی کتب بھی منظر عام پر ہیں۔ اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ فریقین کی اسماء الرجال کی کتب سے ایسے راویوں کے حالات پر مزید تحقیقی نظر ڈالی جائے جو دونوں کشتیوں میں سوار ہو کر شعوری یا غیر شعوری طور پر تخریب و تفریق کا سبب بنتے رہے ہیں۔ تاریخی روایات کے بیشتر راوی کذاب مجہول الحال ہیں۔ اکثر روایتیں منقطع ہیں، شاید ہی کوئی روایات ایسی ہوں جو اصول روایت و درایت کی متحمل ہو سکیں۔ بعض متقدمین حضرات کی طرف منسوب تاریخی کتب میں جو نہایت قابل اعتراض مواد موجود ہے تو یہ بھی سوچنا چاہئیے کہ اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ ان کتب میں اہل باطل کی طرف سے مذموم مقاصد کے لئے مواد بھرتی نہ کیا گیا ہو۔ آج صحابہ کرام کے متعلق کتاب اللہ کی نصوص صریحہ کو تو معاذاللہ طاق نسیان پر رکھ دیا گیا ہے اور ان غلیظ روایات کا اسیر ہو کر طرح طرح کے وسوسوں کو پرورش پانے کا موقع فراہم کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالی ہماری حفاظت فرمائے اور عقل سلیم کی نعمت اور ہدایت کی نعمت سے نوازے۔ (آمین)

(چوتھی قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سابقون الاولون میں شامل ہیں۔ سورہ نور کی آیت استخلاف کا مصداق ہونے کی بناء پر خلفائے راشدین میں داخل اور احق بالخلافتہ ہیں۔ دراصل خلافت راشدہ علی منہاج النبوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس معجزے کی مدت کے اختتام کے اسباب پیدا ہوئے۔ خلافت راشدہ علی منہاج النبوہ کی اپنے ابتدائی ادوار میں بے مثال کامیابی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نہ صرف خلفائے راشدین احسن الخلائق تھے بلکہ مسلم رعایا بھی بہترین اخلاق و کردار کی حامل تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دور اور حضرت علی رضی اللہ کے زمانے میں نو مسلموں کی بہت بڑی تعداد کے ساتھ ساتھ سبائیوں اور منافقین کی خاصی تعداد بھی موجود تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ خلیفہ راشد علی منہاج النبوہ ہونے کی بناء پر تقوی اور پرہیزگاری کے انتہائی بلند مقام پر فائز تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے سلسلے میں وہ مشکوک اور مشتبہ لوگوں پر کھلا ہاتھ ڈالنے سے اس لئے گریزاں تھے کہ کہیں بے قصور لوگ بھی گرفت میں نہ آجائیں۔ خلفائے راشدین کے بعد کی خلافت کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہو لیکن وہ علی منہاج النبوہ والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کی حامل نہیں تھی۔ خلفائے راشدین علی منہاج النبوہ مقام تقوی سے قطعاً نیچے نہیں اتر سکتے تھے، ادہر فتوی یہ ہے کہ امن و امان کی برقراری کے لئے ہر مشتبہ شخص پر ایک حد تک سختی روا ہے ورنہ جرائم کا استیصال ناممکن ہے۔ ان حالات میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت کا ہونا نعمت عظمی سے کم نہیں جن کی وجہ سے حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ دونوں طرف کے مفسدین کی اپنی اشتعال انگیزی سے جنگ صفین میں یہی لوگ زیادہ تر

لقمہ اجل بنے۔ ان میں سبائیوں کی اکثریت بھی اپنے انجام کو پہنچی۔ اس کے باوجود جو بچ رہے بعد کے حالات میں مختار ثقفی اور حجاج بن یوسف جیسے لوگ اللہ تعالی نے ان پر مسلط کر دیے۔ یہ مقام عبرت ہے کہ اللہ تعالی نے ایسے غیبی اسباب پیدا فرمائے کہ قاتلین عثمان اور قاتلین حسین (رضی اللہ عنہما) ایک سال کے اندر ہی اندر اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے۔ اگرچہ ان حوادث میں بہت سے نیک لوگوں کو بھی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور کئی ایک مرتبہ شہادت پر بھی فائز ہوئے لیکن مفسدین کی اکثریت ایسی مرعوب و مغلوب ہوئی کہ سبائی تحریک زیر زمین کام کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اور کوئی چوتھی صدی ہجری میں جا کر انہیں کچھ ابھرنے کا موقع ملا

خوب غور کیجئیے جس طرح غزوہ بنی نضیر میں یہودیوں کے کھجوروں کے درخت کاٹنے کے نبوی حکم کی ایک حد تک تعمیل ناگزیر تھی لیکن ساتھ ہی صحابہ کرام کی ایک جماعت کی طرف سے عدم تعمیل بھی مسلمانوں کے بہترین مفاد میں تھی۔ اسی طرح سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی اگرچہ شرعا مطلوب تھی لیکن ساتھ ہی صحابہ کرام کی ایک جماعت کی طرف سے عدم بیعت بھی امت کے بہترین مفاد میں تھی۔ جس طرح غزوہ بنی نضیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی عدم تعمیل پر پیدا ہونے والے اشکال کا اللہ تعالی نے سورہ حشر میں یہ کہہ کر ازالہ فرمایا کہ یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوا ، یعنی کسی بھی فریق پر کوئی الزام نہیں ہے، اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہ کی بیعت نہ کرنے سے پیدا ہونے والے اشکال کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ فرما کر ازالہ فرما دیا کہ میرا یہ بیٹا سردار ہے، اللہ تعالی اس کے ذریعے سے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان صلح کروائے گا۔ چنانچہ اس صلح کے بعد فریقین پر کوئی الزام باقی نہ رہا

ہمیں ایمان اس لئے عزیز ہے کہ اس کے مقابلے میں کفر موجود ہے، عافیت اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں بلاء اور مصیبت موجود ہے، صحت اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں

مرض موجود ہے، علم اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں جہالت موجود ہے، تقوی اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں فسق وفجور موجود ہے، ہدایت اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں کفر وضلال موجود ہے، غنا اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں فقر وفاقہ موجود ہے۔ اسی طرح صحابہ کرام کے خلاف دلوں میں کینے کا نہ ہونا ہمیں اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں ان معلوم العاقبہ صحابہ کرام کے خلاف بغض و کینہ بھی موجود ہے اور رہے گا۔ تبھی تو سورہ حشر میں ہمیں یہ دعا سکھائی گئی ہے؛

ربنا اغفر لنا ولاخوننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رءوف رحیم۔۔۔ اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے بھائیوں کو بخش دے وہ جنہوں نے ایمان میں ہم سے سبقت کی اور جو ایمان لائے ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لئے کوئی کینہ نہ ہونے دے۔ ائے ہمارے رب! بے شک تو شفقت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اگر دنیا میں اصحاب رسول کے خلاف کینہ موجود ہی نہ ہو تو دعا سکھانا معاذاللہ عبث اور بے مقصد قرار پاتا۔ اللہ اور اس کا کلام ہر عیب سے پاک ہے۔ مشیت الٰہیہ کا تقاضا یہی ہے۔۔ ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربک ولذالک خلقھم (ہود) یہ لوگ باہم ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر تیرا رب رحم فرمائے اور اسی لئے ان کو پیدا کیا ہے

یہاں یہ بھی غور کرنا چاہئیے کہ اگر مشاجرات صحابہ کرام کے بعض حوادث پیش ہی نہ آتے تو صحابہ کرام کے خلاف دلوں میں کینے کا کوئی سبب ہی موجود نہ ہوتا۔ اللہ تعالی نے ہمیں آزمائش میں ڈال دیا لیکن کمال رحمت اور مہربانی سے ہمیں کینے سے محفوظ رکھنے کے لئے مذکورہ بالا دعا بھی سکھا دی جس سے اہل حق اور اہل باطل میں بخوبی امتیاز بھی ہوگیا

بعض اوقات تاریخی جزئیات میں تحقیق سے قول شاذ قطعاً درست اور قول مشہور قطعاً غلط ثابت ہوتا

ہے۔ مثلا تمام اہل سیر و مغازی زمنی اعتبار سے غزوہ تبوک کو مقدم اور حج ابی بکر صدیق (رض) کو موخر سمجھتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مجلّہ السیرہ عالمی (زوار اکیڈمی پبلیکیشنز ناظم آباد 4 کراچی) شمارہ نمبر 13 میں ناقابل تردید عقلی و نقلی شواہد سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ حج ابی بکر صدیق (رض) مقدم اور غزوہ تبوک موخر ہے۔ اور مثلا شمارہ نمبر 32 اور 33 میں ناقابل تردید دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ کا مہینہ ربیع الاول ہماری قمری ہجری تقویم کا ہرگز (بار بار دہرایئے) ہرگز نہیں بلکہ اس دور میں رائج نسی والی (قمریہ شمسی تقویم) کا مہینہ ہے۔ خالص قمری تقویم کا مہینہ رمضان المبارک ہے جو تیسری صدی کے نامور ماہر انساب و ایام زبیر بن بکار نے بالکل درست بیان کیا ہے۔ لیکن اسے قول شاذ سمجھتے ہوئے ناحق نظرانداز کر دیا گیا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مشاجرات صحابہ کرام میں توقف و سکوت یا فریقین کو مصیب (حق بجانب) قرار دینے کا موقف اہل سنت والجماعت میں سے ایک قلیل جماعت کا بھی ہو تو بھی یہی موقف اقرب الی الصواب ہے۔

حضرت موسی علیہ السلام نے اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو داڑھی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو یہ دونوں حضرات وصف نبوت میں باہم شریک ہیں اور حضرت موسی علیہ السلام کا مقام و مرتبہ حضرت ہارون علیہ السلام سے بلند ہے لیکن دوسروں کو ہرگز حق نہیں پہنچتا کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی توہین پر اتر آئیں بعینہٖ اسی طرح حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) وصف صحابیت میں شریک ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کا مقام و مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بلند ہے۔ اگر انہوں نے حضرت معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو باغی یا مخطی قرار دیا تو بعد والوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ حضرت معاویہ کے متعلق یہی رویہ اختیار کریں۔ خصوصا جبکہ بعد والے اپنے علم کے اعتبار سے مجہول العاقبہ اور صحابہ کرام معلوم العاقبہ ہیں

خلفائے راشدین کی خلافت کے علی منہاج النبوہ (par excellent) کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے بعد خلافت راشدہ ہو ہی نہیں سکتی۔ خلافت تو ایک طرف رہی ملوکیت بھی راشدہ ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالی نے بنی اسرائیل پر اپنے جو احسانات بیان فرمائے ان میں یہ بھی ہے؛۔ وجعلکم ملوکا ملوکیت نعمت جبھی ہو سکتی ہے جبکہ یہ ملوکیت راشدہ ہو۔ تمام صحابہ کرام راشد تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی راشدہ تھی اور آپ خلیفہ راشد تھے۔ اگر اسے ملوکیت عاضہ (کاٹنے والی) بھی کہا جائے تو اس معنی میں درست ہے کہ یہ مفسدین اور سبائیوں کے لئے عاضہ ہی تھی۔ خلفائے راشدین تقوی کے انتہائی بلند مقام پر فائز ہونیکی وجہ سے کسی مشتبہ شخص پر ہاتھ ہی نہیں ڈالتے تھے، دیکھئیے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کو ان کے قاتل فیروز لوء لوء مجوسی نے ایک انداز سے قتل کی دھمکی دے ڈالی تھی، اسی طرح ابن ملجم خارجی نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کو اپنے انداز میں قتل کی دھمکی دے ڈالی تھی لیکن لوگوں کے کہنے کے باوجود دونوں خلفائے راشدین نے انہیں اپنی گرفت میں یہ کہتے ہوے نہیں لیا کہ انہوں نے ابھی کسی جرم کا ارتکاب تو نہیں کیا۔ اس طرح کی مراعات ان مفسدوں کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہرگز دینے کے لئے تیار نہیں تھے، اسی لئے ان کی حکومت ان مفسدوں کے لئے ملوکیت عاضہ ہی ثابت ہوئی

(پانچویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(1) سورہ نور کی آیت استخلاف میں جس خلافت کا اللہ تعالی نے وعدہ فرمایا ہے اور جس کی طرف واضح اشارہ سورہ حج کی آیت تمکین میں بھی ہے تو بعد میں پیش آنیوالے حالات کے مطابق یہ خاص الخاص خلافت راشدہ صرف اور صرف پہلے چاروں خلفاء رضی اللہ عنہم کے لئے ہے۔
کیونکہ اولا سورہ حج کی آیت تمکین میں واضح اشارہ موجود ہے کہ یہ خلافت موعودہ بہاان مہاجرین کے لئے ہے جنہوں نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت فرمائی تھی۔ ثانیا سورہ نور کی آیت استخلاف میں کلمات آمنوا و عملواالصلحت فعل ماضی کے صیغے ہیں اگرچہ سیاق کلام کی رو سے ماضی کے صیغوں سے مستقبل کا بھی تعلق ہو سکتا ہے لیکن آہت زیر نظر میں آمنوا کے بعد "منکم" کی ضمیر حاضر نے اسے صرف ان صحابہ کرام رض کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے جو نزول آیت کے وقت مدینہ منورہ میں موجود تھے۔
ثالثا اگر اس خلافت کا وعدہ بعد کے ادوار کے مومنین صالحین کے لئے بھی ہوتا تو آیت میں کلمہ "منکم" لانے کی قطعاً ضرورت نہ ہوتی اور تمام ادوار کے مومنین صالحین کے لئے درمیان میں "منکم" لائے بغیر ہی وعد اللہ الذین آمنوا و عملواالصلحت کے کلمات ہر لحاظ سے بالکل کافی اور وافی ہوتے۔ کلام میں کسی بھی لفظ کو بلا ضرورت لانا عیب ہے اور اللہ تعالی اور اس کا کلام ہر عیب سے پاک ہے۔
(2) کسی بھی نعمت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اللہ تعالی اس کی پیشگی بشارت دے اور وعدہ فرمائے پس جب یہ کہا جائے کہ آیت استخلاف کے وعدے کے خاص الخاص موعودلہم صرف اولین خلفاء اربعہ ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بعد کے ادوار کے مومنین صالحین کو خلافت راشدہ کی نعمت حاصل

ہو ہی نہیں سکتی یا حاصل نہیں ہو گی۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعد کے ادوار کے مومنین صالحین کی خلافت راشدہ بھی راشدہ تو رہے گی لیکن اسے خلافت موعودہ بہا نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس کی پیشگی خبر یا بشارت اللہ تعالی نے نہیں دی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے گو سب صحابہ کرام رض جنتی ہیں (یوم لایخزی اللہ النبی والذین آمنوا معہ..) لیکن نام بنام جن صحابہ کرام رض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت سنائی وہ صرف دس حضرات ہیں جنہیں عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے اور ان میں خلفاء اربعہ بھی شامل ہیں۔

(3) پس اس اعتبار سے خلافت راشدہ کی دو قسمیں ہیں۔ خلافت راشدہ موعودہ بہا اور خلافت راشدہ غیر موعودہ بہا۔ ظاہر ہے کہ جس خلافت راشدہ کے وعدے اور بشارت کا اللہ تعالی نے خاص الخاص اہتمام فرمایا وہ خلافت غیر موعودہ بہا سے یقینا افضل و برتر ہے جیسے عشرہ مبشرہ کو جنت کی خصوصی بشارت میں انہیں تمام دیگر صحابہ کرام پر فضیلت عطا فرمادی ہے۔ اسی لئے خلفاء اربعہ کی خلافت راشدہ جو علی منہاج النبوہ کہا جاتا ہے یہ دراصل خلافت موعودہ بہا ہی ہے۔ الفاظ کا یہ اختلاف محض تعبیر کا اختلاف ہے۔ آیت استخلاف میں خلافت کا وعدہ اگرچہ نزول آیت کے وقت کے تمام مہاجرین و انصار سے ہے لیکن لسانی محاورات کے مطابق جس نعمت کا فائدہ پوری قوم کو پہنچے اس کی نسبت سب کی طرف کر دی جاتی ہے یعنی خلفاء اربعہ خاص الخاص موعود لہم ہیں جو بالفعل منصب خلافت پر فائز ہوئے اور دیگر حضرات بالعموم موعود لہم ہیں کہ وہ اس خلافت موعدہ بہا سے مستفید ہوئے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے یوں احسان جتایا، وجعلکم ملوکا (اور اس نے تمہیں بادشاہ بنایا تھا)۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بنی اسرائیل کا ہر فرد بادشاہ ہو گیا تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو اسرائیلی بادشاہ ہوئے تو سب بنی اسرائیل ان کی بادشاہت سے مستفید ہوئے۔

(4) خلفائے راشدین کی خلافت راشدہ کی علت ایمان اور اعمال صالحہ ہے چنانچہ بعد کے ادوار میں اسی علت کی بناپر جنہیں خلافت راشدہ کی نعمت ملے وہ بھی آیت استخلاف کے یوں مصداق ہوں گے کہ اگرچہ ان کی خلافت غیر موعودہ بہاہے لیکن آیت میں خاص شان نزول کو ہی نہیں دیکھا جاتا بلکہ اعتبار عموم کا ہوتا ہے۔العبرہ للعموم لا لخصوص المورد۔ لیکن جو لوگ بھی کسی بشارت والی آیت قرآنی کا مصداق ہوں (خواہ وہ اس بشارت کا خاص موعود لہم ہوں یا نہ ہوں) تو ان کے مراتب ومدارج کا باہم یکساں ہونا قطعاً ضروری نہیں۔ پس بعد والے خلفائے راشدین جن کی خلافت موعودہ بہا نہیں ان کا مرتبہ ان خلفائے راشدین کے برابر نہیں ہوسکتا جن کی خلافت موعودہ بہاہے اگرچہ ایمان اور اعمال صالحہ کی علت سب میں مشترک ہے۔ بالفاظ دیگر کسی وصف اور علت میں اشتراک سے مدارج و مراتب میں مساوات لازم نہیں آتی۔ مثلا سورہ اللیل میں ہے۔ . وسیجنبھا الا تقی الذی یوتی مالہ یتزکی (اور عنقریب اس آگ سے وہ پرہیزگار ترین شخص بچایا جائیگا جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے اللہ کی راہ میں دیتا ہے)۔شان نزول کے اعتبار سے اس آیت کا خاص مصداق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ ہیں۔ یہاں آگ سے نجات کی علت انفاق فی سبیل اللہ ہے پس جس فرد میں بھی دیگر متعلقہ شرائط کے ساتھ یہ علت موجود ہوگی وہ نجات یافتہ تو ہوگا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ مرتبے اور فضیلت میں بھی حضرت ابو بکر صدیق رض کے مقام تک جا پہنچے گا۔ چنانچہ آیت میں لفظ "اتقی" سے حضرت ابو بکر صدیق رض کے افضل الامہ بعد الانبیاء ہونیکی طرف اشارہ بھی موجود ہے۔

(چھٹی قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم نے ان مباحث میں سہولت فہم کے لئے خلافت راشدہ کو دو اقسام خلافت راشدہ موعودہ بہا اور خلافت راشدہ غیر موعودہ بہا میں جو تقسیم کیا ہے تو صرف اور صرف سورہ حج کی آیت تمکین اور سورہ نور کی آیت استخلاف کے تحت کیا ہے۔ اس کی رو سے خلفاء اربعہ کی خلافت کو ہم خلافت راشدہ موعودہ بہا اور سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور بعد والوں کی خلافت کو خلافت راشدہ غیر موعودہ بہا قرار دیتے ہیں۔ فرق مراتب کے اعتبار سے خلفاء اربعہ کی خلافت راشدہ موعودہ بہا کو ہم سیدنا معاویہ رض اور بعد کے حضرات کی خلافت راشدہ غیر موعودہ بہا سے افضل و برتر ٹھہراتے ہیں اور خلفاء اربعہ کی اسی خلافت راشدہ کو ہم دوسرا نام خلافت راشدہ علی منہاج النبوہ کا دیتے ہیں جو محض تعبیر کا اختلاف ہے۔ بارہ خلفاء والی صحیح حدیث کو پیش نظر رکھا جائے تو حضرت معاویہ رض کی خلافت اگرچہ آیت استخلاف والی خلافت موعودہ بہا نہیں بلکہ غیر موعودہ بہا ہے لیکن بارہ خلفاء والی حدیث کے تحت نہ صرف خلفاء اربعہ بلکہ ان کے بعد سیدنا حضرت حسن رض، سیدنا حضرت معاویہ رض اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کی خلافت بھی اہل حق کے نزدیک خلافت موعودہ بہا ہی ہے۔ یہ سات خلفاء ہوئے، باقی ماندہ کون سے خلفاء بارہ خلفاء والی حدیث کے تحت آتے ہیں تو اس کے متعلق جن حضرات نے جو نام بھی شمار کئے ہیں تو انہیں اس حدیث کا صحیح مصداق ٹھہرانا یقینی نہیں بلکہ ظنی ہے۔ بعض حضرات حضرت امام مہدی رح کو بھی ان میں شامل کرتے ہیں۔ الغرض قرآن و سنت دونوں کو ملحوظ رکھا جائے تو خلافت موعودہ بہا کی مزید دو اقسام خلافت موعودہ بہا خاصہ اور خلافت موعودہ بہا عامہ قرار پاتیں ہیں۔ خلافت موعودہ بہا خاصہ کا حقیقی مصداق خلفاء اربعہ ہیں اور خلافت راشدہ موعودہ بہا عامہ کا حقیقی مصداق سیدنا

حضرت حسن رض، سیدنا حضرت معاویہ رض اور سیدنا عمر بن عبدالعزیز رح ہیں۔ بارہ کے عدد کو پورا کرنے کے لئے باقی حضرات کے جو نام بعض اہل علم نے بیان فرمائے ہیں ان کا صحیح ہونا یقینی نہیں بلکہ ظنی ہے۔ اصطلاحات میں اختصار پیدا کرنے لئے اہل علم نے خلفاء اربعہ کی خلافت کو خلافت راشدہ خاصہ اور بعد والے نیک خلفاء کی خلافت کو خلافت راشدہ عامہ قرار دیا ہے۔ مزید اختصار کے لئے خلفاء اربعہ کی خلافت کو خلافت راشدہ اور اس سے امتیاز کے لئے بعد والے نیک خلفاء کی خلافت کو خلافت عادلہ کا نام دیا۔ چونکہ حضرت معاویہ رض صحابی بھی ہیں اور تمام صحابہ کرام بموجب قرآن راشدون ہیں اس لئے حضرت معاویہ رض کی خلافت راشدہ عامہ بھی بعد والوں کی خلافت عادلہ سے افضل و برتر ہے۔

سورہ حدید میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے، جن صحابہ کرام نے فتح مکہ سے پہلے اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کیا اور قتال کیا، ان کا درجہ فتح مکہ کے بعد مال خرچ کرنے والوں اور قتال کرنے والوں سے بلند تر ہے، تاہم اللہ تعالی نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ فرما رکھا ہے۔ (الحدید-10)

خود مہاجرین و انصار میں فرق مراتب فرماتے ہوئے اللہ تعالی نے سورہ توبہ میں سابقون الاولون صحابہ کرام سے رضامندی کا اظہار فرمایا اور بعد میں ان اسلام قبول کرنے والوں مہاجرین و انصار سے بھی رضامندی ظاہر فرمائی جو ان سابقون اولون مہاجرین و انصار کی خوش اسلوبی سے پیروی کریں۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام میں فرق مراتب سے (معاذاللہ ثم معاذاللہ) کسی پیغمبر کی توہین مقصود ہو تو یہ تو کفر ہے۔ اگر صحابہ کرام کے فرق مراتب کے بیان میں کسی صحابی کی توہین مقصود ہو تو یہ گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن اگر کوئی فکری لغزش کی بناپر حفظ مراتب کا خیال نہیں کرتا اور افراط و تفریط سے کام لیتا ہے تو اس کی اصلاح کی پیش نظر فرق مراتب کو بیان کرنا تو عین مطلوب و مقصود ہے، جیسا کہ سورہ توبہ اور سورہ حدید کے متعلقہ مضامین سے واضح بھی ہے۔

آیت استخلاف میں اس وقت کے مومنین صالحین سے اللہ تعالی نے تمکین دین کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔
یہاں تمکین دین اور تمکین امارت وحکومت کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہئیے۔ خلفاء اربعہ کے ذریعہ دین حق یعنی اسلام خوب واضح اور نمایاں ہوا اور اسے کفار پر عسکری و سیاسی غلبہ بھی حاصل رہا، اس کے باوجود چونکہ اللہ تعالی نے کسی سے تمکین امارت وحکومت کا وعدہ نہیں فرمایا تھا لہٰذا حضرت علی رض کی بیعت اگر بعض صحابہ کرام نے نہیں بھی کی تو اس کے باوجود جب اہل حق کے نزدیک وہ بالاتفاق خلیفہ راشد ہیں تو لامحالہ ان کی خلافت بھی خلافت راشدہ موعودہ بہا ہے۔ سیدنا حضرت معاویہ رض اور بعد کے حضرات کی خلافت راشدہ غیر موعودہ بہا سے بدیہی طور پر افضل و برتر ہے۔ اسی طرح اگرچہ حضرت عثمان رض کی امارت وحکومت باغیوں کے ہاتھوں خلل پذیر ہوئی یہاں تک کہ باغیوں نے انہیں شہید بھی کر ڈالا تو بھی ان کی خلافت راشدہ کا موعودہ بہا ہونا قطعاً متاثر نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالی نے تمکین دین کا وعدہ فرمایا تھا، کسی کی امارت وحکومت کے استحکام کا نہیں۔
خلافت راشدہ اور امارت وحکومت میں جو لطیف فرق ہے اسے نظر انداز کرنا بھی فکری لغزش ہے۔
خلافت راشدہ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح جانشینی کے ذریعے دین حق کی صحیح ترجمانی اور اس کے عملی نفاذ کی صحیح کوشش ہے جو خلیفہ کے لئے امارت وحکومت کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ پس امارت وحکومت خلافت راشدہ کا محض ایک پہلو ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے رسول اور نبی کے ذمہ مومنین کی تعلیم وتربیت اور ان کا تزکیہ اخلاق اور ان پر شرعی حدود و قوانین کا نفاذ بھی ہے اور یہ ذمہ داری بھی امارت وحکومت کا تقاضا کرتی ہے۔ لہٰذا امارت وحکومت کو رسالت کا بھی ایک اہم پہلو قرار دینا ہوگا۔ امارت وحکومت کا صحیح نہج پر قائم رہنا محکومین کے تعاون پر موقوف ہے۔ اگر یہ تعاون رسول کو حاصل نہ ہو اور اس کی وجہ سے کسی وقت انتظامی امور میں اصلاح احوال رسول کے اختیار میں نہ رہے تو غور کیجئیے اس میں رسول کا کیا قصور ہے؟ اور اس کا وصف رسالت بھلا کیوں خلل پذیر ہوگا؟ مثلا

حضرت موسی علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل نے آپ کی حکم عدولی کرتے ہوئے قوم عمالقہ کے خلاف قتال سے یہ کہہ کر صاف انکار کردیا تھا کہ تو اور تیرا رب تم دونوں قتال کرتے رہو ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ اس پر حضرت موسی علیہ السلام نے اپنی بے بسی کا اللہ تعالی کے سامنے یوں اظہار فرمایا۔۔ رب انی لا املک الا نفسی واخی۔۔ یعنی اے میرے رب میں اپنے اور اپنے بھائی کے علاوہ کسی پر اختیار نہیں رکھتا (المائدہ 25-24)۔ اس کے برعکس حضرت سلیمان علیہ السلام کی امارت وحکومت نہایت مستحکم، حدود مملکت نہایت وسیع اور انسانوں کے علاوہ جنات بھی ان کے مسخر تھے۔ اب اگر سطحی سوچ رکھنے والا کوئی شخص حضرت سلیمان علیہ السلام کی امارت وحکومت کے استحکام اور مملکت کی وسعت کے حوالے سے ان کے وصف نبوت کا تقابل حضرت موسی اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے وصف نبوت سے کرنے لگے اور حضرت موسی علیہ السلام کے حق میں تفریط کا شکار ہو جائے تو یقینا ایسا شخص غلطی پر ہوگا۔ اسی طرح خوب سمجھ لیجئیے کہ اگر حضرت علی رض کی بیعت کچھ یا بالفرض بہت سے صحابہ کرام نے نہیں کی تو اس میں حضرت علی رض کا کیا قصور ہے؟ اور ان کا خلافت راشدہ موعودہ بہا والا وصف بھلا کیوں خلل پذیر ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی امارت وحکومت حضرت معاویہ رض کی امارت وحکومت کے مقابلے میں غیر مستحکم تھی، جیسے حضرت موسی علیہ السلام کی امارت وحکومت حضرت سلیمان علیہ السلام کی امارت وحکومت کے مقابلے میں کمزور اور غیر مستحکم تھی۔ یہاں جیسے حضرت موسی علیہ السلام بے اختیار تھے اسی طرح حضرت علی رض بھی بے اختیار تھے۔ اس سے حضرت موسی علیہ السلام کے وصف رسالت و نبوت میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ امارت وحکومت تو وصف رسالت کا محض ایک پہلو ہے۔ اسی طرح حضرت علی رض کی خلافت راشدہ موعودہ بہا بھی خلل پذیر نہیں ہوتی کیونکہ امارت وحکومت خلافت راشدہ کا بھی محض ایک پہلو ہے۔ جس طرح اللہ تعالی نے حضرت موسی علیہ السلام سے ان کی امارت وحکومت کے استحکام کا کوئی وعدہ نہیں فرمایا تھا

بلکہ " کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی " کے تحت تمکین دین کا وعدہ تھا جو پورا ہوا، بالکل اسی طرح آیت استخلاف میں خلفاء اربعہ سے عطائے خلافت اور تمکین دین کا وعدہ تو تھا لیکن امارت وحکومت کی تمکین کا وعدہ نہیں تھا۔ چنانچہ تمکین دین کا وعدہ بحمداللہ علی وجہہ الکمال پورا ہوا، خواہ ان کو امارت وحکومت کا استحکام حاصل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، برقرار رہا ہو یا نہ رہا ہو۔

(ساتویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صلح نامہ حدیبیہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ سب اپنے اپنے قربانی کے جانور ذبح کریں، تو پہلے پہل کوئی ایک بھی اس حکم کی تعمیل کے لئے نہیں اٹھا، بعد میں جب تعمیل بھی کی تو اس میں بھی ان کی دلی رضامندی شامل نہیں تھی اور وہ اس قدر رنجیدہ تھے کہ ایک دوسرے کے بال مونڈتے ہوئے لگتا تھا کہ شدت غم سے وہ ایک دوسرے کے گلے کاٹ بیٹھیں گے۔ بعد میں جب اللہ تعالی نے اسے فتح مبین قرار دیا تو پھر کہیں جاکر سب کو اطمینان اور خوشی ہوئی۔ اس سے جو بہت سی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں ان میں سے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ کسی معقول عذر کی بناپر سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم تعمیل بھی عنداللہ جرم نہیں، تو کسی خلیفہ راشد کے کسی حکم کی عدم تعمیل کیونکر جرم ہو سکتی ہے؟ رسول کی رسالت و نبوت کا انکار کرنا یا اقرار کے باوجود اس کے حکم کو سرے سے حجت (واجب التسلیم) ہی نہ سمجھنا اور بات ہے لیکن کسی معقول عذر کی بناپر تعمیل نہ کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ صلح حدیبیہ والے معاملے میں پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی عدم تعمیل اور پھر دلی رضامندی کے بغیر تعمیل پر صحابہ کرام رض کو ہرگز فاسق نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ اس کا ان کے پاس ان کے خیال میں معقول عذر یہ تھا کہ صلح کی شرائط بظاہر مسلمانوں کے مفاد کے سراسر خلاف نظر آرہی تھیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ شاید وحی کے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اپنی صلح جویانہ صوابدید اور طبعی نرم خوئی کی بناء پر ان شرائط کو قبول کرلیا ہے اور شاید وحی کے ذریعہ صورت حال بدل جائے۔ لیکن جب وحی خداوندی سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موقف کی تائید و توثیق ہو گئی تو وہ پوری طرح مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے (معاذاللہ ثم معاذاللہ) آپ کی رسالت یا آپ

کے حکم کی حجیت سے ہر گز انکار نہیں کیا تھا۔اس طرح کی عدم تعمیل تو کھلا کفر ہے اور اگر عدم تعمیل تساہل و تکاسل کی بناء پر ہو لیکن تعمیل نہ کرنے والا حاکم مجاز کے حکم کی حجیت کا منکر نہ ہو تو وہ فاسق و فاجر تو ہے کافر نہیں۔ان امور کی روشنی میں ہم سید نا حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ اور سید نا معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ کی خلافت کی طرف آتے ہیں۔اس طرح کی باتیں کہ سید نا معاویہ رض کی خلافت پر تو صحابہ کرام کا اجماع تھا لیکن حضرت علی رض کی خلافت پر اجماع نہیں ہوا، ایک سطحی سوچ کی غماز ہیں بلکہ کہنا یوں چاہئیے کہ حضرت معاویہ رض کی بیعت خلافت پر صحابہ کرام کا اجماع ہو گیا لیکن حضرت علی رض کی بیعت خلافت پر صحابہ کرام کا اجماع نہیں ہوا۔ جہاں تک نفس خلافت کا تعلق ہے تو سید نا حضرت علی رض کی خلافت ہمیشہ متفق علیہا رہی ہے۔خلافت راشدہ اور امارت و حکومت کا فرق ہم ان مباحث میں قبل ازیں بیان کر چکے ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالی عنہ سے مصالحت سے پہلے حضرت معاویہ رض نے کبھی بھی اپنی خلافت کا دعوی یا اعلان نہیں فرمایا، لہٰذا ان ایام میں آپ خلیفہ نہیں بلکہ صرف امیر و حاکم تھے اور آپ کی بیعت امارت بھی متفق علیہا نہیں تھی۔

بعض کتابوں میں جو لکھا ہے کہ حکمین کے فیصلے کے بعد لوگوں نے حضرت معاویہ رض کی بیعت خلافت کی تو وہاں خلافت اور امارت کے اس لطیف فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ ہر خلیفہ لازما امیر بھی ہوتا ہے لیکن امارت و حکومت عام ہے اور ہر امیر اور حاکم کا خلیفہ ہونا ضروری نہیں چنانچہ حضرت معاویہ رض کی اسی بیعت امارت و حکومت کو بعض حضرات نے بیعت خلافت سمجھ لیا اگر ایسا ہوتا تو حضرت معاویہ رض برملا حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کی خلافت کو ناجائز اور غلط قرار دیتے اور ان کے مقابلے میں اپنی خلافت کے صحیح ہونیکا اعلان کرتے۔ان کا آخر تک خیال یہی رہا کہ حضرت علی رض کا قاتلین عثمان رض سے قصاص لینے کے معاملے میں تاخیر سے کام لینا مفسدین کی شرارتوں کو تقویت پہنچا رہا ہے۔ چونکہ انہوں نے ان کی بیعت نہیں کی لہٰذا اپنے حلقے میں انہوں نے اپنے آپ کو امیر اور حاکم کے

منصب پر قائم رکھانہ یہ کہ حضرت حسن رضی اللہ تعالی عنہ سے مصالحت سے پہلے انہوں نے اپنے خلیفہ ہونے کا کوئی باقاعدہ اعلان کیا تھا۔ ان ایام میں وہ امیر و حاکم تھے خلیفہ نہیں تھے۔

حضرت معاویہ رض نے کبھی بھی یہ دعوی نہیں فرمایا تھا کہ حضرت علی رض کی خلافت غلط اور میری خلافت درست ہے۔ چونکہ انہوں نے بیعت خلافت سے انکار کیا تھا، اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کے قصاص کے مطالبے کی تکمیل کی خاطر وہ اپنے حلقے میں اپنی امارت و حکومت قائم کئے ہوئے تھے نہ یہ کہ انہوں نے کبھی خلافت کا دعوی کیا تھا۔

حضرت حسن رضی اللہ تعالی عنہ سے مصالحت کے بعد ان کی خلافت اور امارت و حکومت یکجا ہو گئی اور سب نے ان کی بیعت پر اتفاق بھی کر لیا۔ اس کے بر عکس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت راشدہ اور امارت و حکومت میں ایک دن کے لئے بھی تفریق نہیں ہوئی اور ان کی خلافت و امارت کے صحیح ہونے پر سب کا اجماع بھی تھا لیکن معقول عذر کی بناء پر ان کی بیعت متفق علیہا نہیں تھی۔ چنانچہ حضرت معاویہ رض اور ان کے ہمنوا حضرت عثمان رض کے خون کے قصاص کو مقدم اور حضرت علی رض کی بیعت کو موخر سمجھتے تھے۔ اگر حضرت معاویہ رض حضرت علی رض کی خلافت و امارت کو (معاذاللہ) ناجائز سمجھتے تو یقینا مقابلے میں اپنی خلافت کا دعوی اور اعلان ضرور کرتے لیکن انہوں نے ایسا ہر گز نہیں کیا۔ پس حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی رض کی خلافت راشدہ ایک ثانیے (سیکنڈ) کے لئے بھی صحابہ کرام اور بعد کے اہل حق لے لئے محل نظر نہیں رہی۔

صرف معقول عذر کی بناء پر بعض صحابہ کرام کو بیعت سے انکار تھا۔ اس کے بر عکس حضرت حسن رض سے صلح سے پہلے تک سیدنا معاویہ رض کی امارت و حکومت متفق علیہا نہیں تھی۔ چونکہ انہوں نے اس عبوری مدت میں اپنی خلافت کا کوئی دعوی کیا ہی نہیں تھا تو ان کی خلافت کے متفق علیہا ہونے اور نہ ہونے کا سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت حسن رض سے مصالحت کے بعد جب وہ باقاعدہ

خلیفہ ہوئے تو بلاشبہ صحابہ کرام کاان کی خلافت پر اجماع ہو گیا، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگی بشارت کے مطابق آپ کے پیارے نواسے اور سیدنا علی رض کے پیارے صاحبزادے حضرت حسن رض کے مصالحانہ رویہ کو پورا پورا دخل حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میرا یہ بیٹا سردار ہے جو مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان صلح کروائے گا۔ خوب غور کیجئیے جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رض اور حضرت معاویہ رض دونوں کے ساتھیوں کو عظیم جماعتیں قرار دیا ہے تو ہمیں اس طرح کی مبہم مردم شماری کی بھلا ضرورت ہی کیا ہے کہ حضرت علی رض کی بیعت چند صحابہ کرام نے نہیں کی تھی یا بیعت نہ کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ پس ان حالات میں دونوں حضرات کی خلافت میں درحقیقت کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا، خصوصاً حضرت علی رض کی خلافت کا برحق ہونا تو کبھی متنازع رہا ہی نہیں۔

روافض نے خلفائے راشدین میں سے پہلے تین خلفاء کے حق میں افسوسناک تفریط (تنقیص) سے کام لیا کہ معاذاللہ وہ ظالم اور غاصب تھے اور چوتھے خلیفہ حضرت علی رض کے حق میں افراط (غلو اور مبالغہ) سے کام لیتے ہوئے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ بلافصل قرار دے ڈالا۔ اس کے رد عمل میں بعض اہل حق روافض کی تفریط کا تعاقب کرتے ہوئے غیر شعوری طور پر حضرت علی رض کے حق میں خود بھی کسی حد تک تفریط کا شکار ہو گئے۔ ہم یہاں " غیر شعوری " کے کلمات اس لئے لائے ہیں کہ یہ حضرات سیدنا علی رض کو ایک طرف تو خلیفہ راشد بھی مانتے ہیں اور انہیں عشرہ مبشرہ میں بھی شمار کرتے ہیں لیکن دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ آیت استخلاف میں اللہ تعالی نے مومنین صالحین سے جو تیسرا وعدہ امن اور بے خوفی کا فرمایا تھا تو حضرت علی رض کے دور خلافت میں استخلاف فی الارض اور تمکین دین کے دونوں وعدے تو پورے ہوئے لیکن باہم خانہ جنگی کی وجہ سے امن قائم نہیں رہا۔ لہٰذا روافض جن خلفائے ثلاثہ کو معاذاللہ غاصب اور ظالم قرار دیتے ہیں تو آیت استخلاف کے حقیقی

موعودلہم تو وہی ہیں جبکہ حضرت علی رض کے دور میں امن اور بے خوفی کی نعمت مسلمانوں کو حاصل نہیں تھی۔ ان حضرات کا ذہن ادہر منتقل نہ ہوا کہ اگر آیت استخلاف میں کیئے گئے تینوں وعدے حضرت علی رض کے دور میں معاذاللہ پورے نہیں ہوئے بلکہ صرف دو ہی وعدے پورے ہوئے حالانکہ حضرت علی رض بھی دیگر اصحاب کی طرح ایمان واعمال صالحہ کی دولت سے مالامال تھے تو (معاذاللہ ثم معاذاللہ) اللہ تعالی کی طرف عہد شکنی منسوب ہوگی یا یہ ماننا پڑے گا کہ (معاذاللہ ثم معاذاللہ) حضرت علی رض خلیفہ راشد تو کجا وہ تو ایمان اور اعمال صالحہ کی نعمت سے بھی محروم تھے۔ بلکہ سیدنا عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کو بھی خلافت راشدہ موعودہ بھا سے نکال باہر کرنا ہوگا کیونکہ حضرت عثمان رض کے دور خلافت کے آخری ایام میں امن کہاں باقی رہا تھا؟ باغیوں نے کافی عرصے تک مدینہ منورہ میں قصر خلافت کا محاصرہ جاری رکھا اور بالاخر آپ کو شہید کرڈالا۔ پس اصل حقیقت یہ ہے کہ چاروں خلفاء کو تینوں نعمتیں علی وجہہ الکمال حاصل رہیں اور آیت استخلاف میں خوف سے مراد مطلق خوف نہیں بلکہ کفار کی جانب سے مسلمانوں کو لاحق ہونے والا وہ خوف مراد ہے جو نزول آیت کے وقت موجود اور بعد میں حسب وعدہ الہی یکسر نیست و نابود ہوگیا تھا۔ اسی لئے تو روافض آیت استخلاف کے وعدوں کو صرف امام مہدی کے لئے تسلیم کرتے ہیں، حالانکہ آیت میں ضمیر حاضر " منکم " موجود ہے اور یہ بات انتہائی نامعقول ہے کہ خطاب تو حاضرین سے ہو لیکن اس کا مصداق سینکڑوں برس بعد آنیوالی ہی کوئی ایک شخصیت ہو اور حاضرین میں سے ایک فرد بھی اس میں شامل نہ ہو۔

(آٹھویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آیت استخلاف کے حوالے سے روافض کے افراط و تفریط کے علمی تعاقب کا صحیح انداز یہ ہے کہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت استخلاف میں جس خلافت کا اس وقت کے مومنین صالحین (صحابہ کرام رض) سے وعدہ کیا گیا ہے تو کیا یہ وعدہ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے بھی تھا یا نہیں؟ اگر نہیں تو انہیں

(معاذاللہ ثم معاذاللہ) ایمان اور اعمال صالحہ کی نعمتوں سے محروم قرار دینا ہوگا۔ اگر یہ وعدہ ان سے بھی تھا اور یقینا تھا تو کیا یہ وعدہ خلافت بلافصل کا تھا یا مطلق خلافت کا تھا؟ اگر مطلق خلافت کا تھا، فھوالمطلوب یہی بات درست ہے۔ اگر خلافت بلافصل کا وعدہ تھا تو مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالی اپنا وعدہ پورا کرنے پر قادر ہے یا نہیں؟ اگر کہا جائے کہ نہیں تو بالاتفاق یہ کلمہ کفر ہے۔ اگر اللہ تعالی ایفائے عہد پر قادر مطلق ہے تو کیا اس نے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے خلافت بلافصل کا (مبینہ) وعدہ پورا فرمایا یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس سے اللہ تعالی کی طرف عہد شکنی کی نسبت ہوتی ہے اور ایسا کہنا بلکہ سوچنا بھی بالاتفاق کفر ہے۔ اگر وعدہ پورا فرمایا تو یہ نفس الامر یعنی خارج (external phenomena) میں پائے جانے والے حقائق کے خلاف ہے۔ حضرت علی رض سے پہلے کے خلفائے ثلاثہ کی خلافت صحیح تھی یا (معاذاللہ) صحیح نہیں تھی دونوں صورتوں میں حضرت علی رض کو خلیفہ بلافصل نہیں کہا جاسکتا۔ پس ایسا کوئی وعدہ اللہ تعالی نے حضرت علی رض سے فرمایا ہی نہیں تھا۔ لہٰذا اس کے حق میں لائے جانے والے تمام نام نہاد دلائل بھی از خود کالعدم ہو جاتے ہیں۔ پس آیت استخلاف کا خاص الخاص موعود لھم پہلے چاروں خلفاء اور عام موعود لھم نزول آیت کے وقت کے سبھی صحابہ کرام ہیں۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ حضرت معاویہ رض کو بعض اہل علم کی تحقیق کے مطابق

مہاجرین میں شمار کیا جائے اور آیت استخلاف کے نزول کو آخری زمانے کا نزول قرار دیا جائے جن کی وجہ سے مہاجرین وانصار اور مولفتہ القلوب سبھی صحابہ کرام اس آیت کا موعود لھم ہو جائیں تو اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ خلفاء اربعہ کی امتیازی حیثیت پھر بھی متاثر نہیں ہوتی۔ اسے ہم ان شاء اللہ ان مباحث میں آئندہ مناسب مقام پر واضح کریں گے۔

قرآن وسنت میں مضمون کسی وعدہ (بشارت) کا ہو یا وعید کا ہو وہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ہم یہاں پہلے بشارت کے مضامین کو لیتے ہیں۔ بشارت کسی خاص فرد یا جماعت کے لئے ہوگی یا بلا تخصیص پوری امت کے لئے ہوگی۔ جس بشارت میں کسی فرد یا جماعت کے لئے تخصیص پائی جائے تو اس کا خارج میں ظہور یقینی ہے اور اس میں لوگ اپنی طرف سے کسی طرح کی شرائط عائد کرنے کے ہرگز مجاز نہیں ہو سکتے ورنہ مخصوص و متعین فرد یا افراد کے لئے اس بشارت کا فائدہ ہی کیا ہوا؟ مثلا سورہ الانفال میں دور نبوی کے مہاجرین وانصار کی تخصیص فرماتے ہوئے اللہ تعالی کا ارشاد ہے۔۔۔ والذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین اووا و نصروا اولئک ھم المومنون حقا لھم مغفرہ ورزق کریم (الانفال 74)

اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے انہیں جگہ دی اور " "مدد کی یہی وہ سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے مغفرت اور باعزت رزق ہے

اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ بشرطیکہ یہ مہاجرین وانصار آخر دم تک ایمان واعمال صالحہ پر قائم رہے ہوں وغیرہ وغیرہ تو اس کا یہ ملعون قول یقینا فاسد و مردود ہے کیونکہ اگر ان حضرات نے متعلقہ شرائط پوری نہ کی ہوتیں یا وہ مستقبل میں ان کو پورا کرنے والے نہ ہوتے تو علیم و خبیر اللہ تعالی انہیں مخصوص کرکے ایمان کامل، مغفرت اور باعزت رزق کی بشارت ہی کیوں دیتا؟ چنانچہ قبلہ اول بیت المقدس کی طرف منہ کرکے کوئی ڈیڑھ سال تک نمازیں ادا کرنے والے مہاجرین وانصار کو اللہ تعالی نے یہ بشارت سنائی۔۔ وماکان اللہ لیضیع ایمانکم ان اللہ بالناس لرووف رحیم (البقرہ 143)

اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے، بے شک اللہ لوگوں پر بڑا ہی مشفق و مہربان "

ہے"۔

پس یہ شیطانی وسوسہ اللہ تعالیٰ نے دور فرمادیا کہ شائد ان مہاجرین وانصار میں سے کچھ لوگ بعد میں مرتد ہوگئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو ان کے ایمان کی بقااور ارتداد سے محفوظ رہنے کی بشارت بھی سنادی۔ یہاں اگر ایمان سے مراد نماز لی جائے تو بھی بشارت اس لئے متاثر نہیں ہوتی کہ مرتد کی تو تمام نیکیاں بر باد ہو جاتی ہیں۔ کسی کے نیک عمل کے اجر کی بقا کی ضمانت اس کے ایمان کی بقا کو بھی یقینا مستلزم ہے۔ منافق کا ایمان سرے سے ہوتا ہی نہیں لہٰذا اس بشارت سے از خود خارج ہوگئے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن کریم میں دو مرتبہ فرمایا ہے۔۔ یاایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم وماواھم جھنم وبئس المصیر (التوبہ 73، التحریم 9)۔ "اے نبی تو کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کر اور ان پر سختی بھی کر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے"۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جن اصحاب سے تادم آخر بہترین معاشرتی تعلقات برقرار رکھے، جن سے رشتے ناطے قائم کرکے ان سے صہری روابط استوار فرمائے وہ ہر گز منافق نہیں ہو سکتے۔ آپ نے فتح مکہ کے بعد حنین و ہوازن کے غنائم نہایت فراخدلی سے مولفتہ القلوب میں تقسیم فرمائے، دیگر حضرات کے علاوہ مشہور روایات کے مطابق حضرت ابوسفیان رض اور ان کے دونوں صاحبزادوں حضرت معاویہ اور حضرت یزید (رضی اللہ عنھما) کو بھی سو سو اونٹ اور ہر ایک کو تقریبا چھ چھ کلو چاندی عنایت فرمائی، حالانکہ ان اموال غنیمت کے بظاہر اصل مستحق مہاجرین کو بہت کم اور انصار کو تو ایک دانہ بھی نہیں دیا گیا۔ بعض اہل علم کی تحقیق کے مطابق بالفرض حضرت ابوسفیان اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنھما) مولفتہ القلوب کی بجائے مہاجرین میں شامل ہوں تو اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ اور اس کے بعد اس خاندان کی انتہائی عزت افزائی کی۔ حضرت ابوسفیان رض کے گھر کو دارالامان قرار دیا گیا اور حضرت معاویہ رض بعد میں

کاتب وحی مقرر ہوئے۔ حضرت ابوسفیان رض کی صاحبزادی ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں تھیں۔ ام المومنین ام حبیبہ رض کے روحانی رشتے سے حضرت معاویہ رض تو پوری امت کے ماموں (خال المومنین) قرار پاتے ہیں۔ اگر یہ سب حضرات فی الحال یا فی المستقبل اسلام میں پختہ نہ ہونے والے ہوتے یا کافر و منافق ہوتے تو اللہ تعالی ان کی تالیف قلب یا ان کی عزت افزائی کی اپنے نبی کو اجازت ہی کیوں دیتا؟ جبکہ وہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ از راہ تاکید دو مرتبہ منافقین پر سختی کرنے کا حکم بھی دیتا ہو۔ پس بشمول خلفائے راشدین تمام مہاجرین و انصار اور فتح مکہ سے پہلے یا بعد میں اسلام قبول کرکے تالیف قلب کی مد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے غنائم وصول کرنے والے صحابہ کرام مرحوم و مغفور اور قطعی جنتی ہیں۔ چنانچہ غزوہ فتح مکہ کے ضمن میں سورہ الممتحنہ میں اللہ تعالی نے اہل ایمان کو یہ بشارت سنائی:۔ عسی اللہ ان یجعل بینکم و بین الذین عادیتم منھم مودہ، واللہ قدیر، واللہ غفور رحیم۔ (الممتحنہ 7)۔ "قریب ہے کہ اللہ تمہارے درمیان اور ان (اہل مکہ) کے درمیان جن سے فی الحال تم دشمنی رکھتے ہو باہم دوستی پیدا کردے اور اللہ بہت قدرت رکھنے والا اور بے حد بخشنے والا نہایت مہربان ہے"۔

یعنی اہل مکہ اسلام قبول کرلیں گے۔ رہی یہ بات کہ سالہاسال کی دشمنی دوستی میں کیسے بدل جائیگی تو اللہ تعالی نے فرمایا، واللہ قدیر، کہ اللہ دلوں کا حال بدلنے پر قادر ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ ظالموں کے گزشتہ جرائم کا کیا ہوگا؟ تو اللہ تعالی نے اسی آیت میں فرمادیا کہ "واللہ غفور رحیم، کہ اللہ بے حد بخشنے والا نہایت ہی مہربان ہے۔ اور مثلا سورہ حدید میں ہے کہ جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور قتال کیا ان کا درجہ ان لوگوں سے بہت بلند ہے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد مال خرچ کیا اور قتال کیا۔۔۔ و کلا وعد اللہ الحسنی۔ اور اللہ نے بھلائی کا وعدہ تو ہر ایک سے کر رکھا ہے۔ پس سورہ الانبیآء میں ہے:۔ ان الذین سبقت لھم منا الحسنی اولئک عنہا مبعدون لا یسمعون حسیسھا و ھم فی ما اشتھت انفسھم خالدون (الانبیاء 101، 102)۔ " بیشک وہ لوگ جن کے لئے ہماری طرف سے بھلائی

طئے ہو چکی تو وہ اس (جہنم) سے دور رکھے جائیں گے، وہ تو اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے اور وہ اس (جنت اور اس کی نعمتوں) میں جیسے ان کے دل چاہیں گے ہمیشہ رہنے والے ہوں گے "۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین پر سختی کرنے کا حکم تو تھا لیکن آپ منافقین کو پوری طرح جانتے نہیں تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ منافقین کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو نہ ہو سکا، بعد والوں کو کس شیطانی وحی سے ان کا علم ہوا؟ نیز اس صورت میں اللہ تعالی پر الزام عائد ہوتا ہے کہ اپنے نبی کو یہ تو بتایا ہی نہیں کہ منافقین کون ہیں؟ لیکن ان پر سختی کرنے کا حکم آپ کو دو مرتبہ دے ڈالا۔ اگر کہا جائے کہ آپ کو منافقین کا علم تو تھا لیکن آپ ان پر سختی کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے یا آپ کو منافقین پر سختی کرنے کی ضرورت پیش ہی نہیں آئی تھی، تو بھی اللہ تعالی پر الزام آئے گا کہ اسے معلوم بھی تھا کہ میرا نبی منافقین پر سختی کرنے سے معذور ہے پھر بھی سختی کرنے کا حکم ایک دفعہ نہیں بلکہ دو دفعہ دے ڈالا۔ یا اللہ تعالی کو معلوم بھی تھا کہ میرے نبی کو منافقین پر سختی کرنیکی ضرورت ہی پیش نہیں آئیگی پھر بھی سختی کرنے کا دو مرتبہ (معاذاللہ ثم معاذاللہ) عبث حکم دے ڈالا۔ اگر یہ انتہائی مضحکہ خیز تاویل کی جائے کہ متعلقہ آیت کا ترجمہ یہ ہے " اے نبی تو منافقین کو ساتھ لے کر کفار کے ساتھ جہاد کر اور ان پر سختی کر " یعنی آیت میں یہاں منافقین کا لفظ مفعول معہ اور واو معیت کے لئے آئی ہے تو یہ لغو تاویل اس لئے مردود ہے کہ مثلاً غزوات احد، احزاب اور تبوک جیسی آزمائشوں میں منافقین کے گھناونے کردار اور ان کی بزدلی کو اللہ تعالی نے سورہ آل عمران، سورہ احزاب اور سورہ توبہ میں خوب خوب نمایاں کیا ہے۔ منافق تو اپنے کفر کو چھپانے کی وجہ سے مار آستین ہے وہ اپنے کافر بھائیوں کے خلاف مسلمانوں کا ساتھ کیسے دے سکتا ہے؟ الغرض ہر طرح کی تاویلات فاسدہ یہاں مردود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب موقع منافقین پر خوب سختی فرمائی۔ مثلاً غزوہ تبوک کے واپسی کے سفر میں مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے آپ نے سریہ روانہ فرما کر منافقین کی تعمیر کردہ مسجد ضرار کو مسمار کرایا۔ اگر فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے زود یا بدیر

اسلام میں پختہ ہونے والے نہ ہوتے تو ان پر سختی کا آپ کے پاس بہترین موقع تھا۔آپ انہیں قتل کرتے یا قیدی بناتے نہ کہ ان کے گھر اموال غنیمت سے بھر دیتے۔جب سبھی صحابہ کرام مہاجرین و انصار اور مولفتہ القلوب اہل مکہ کا قطعی جنتی ہونا اور مرحوم و مغفور ہونا علی وجہ الکمال ثابت ہو گیا تو یہ کہنا کس قدر لغو اور اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے کہ یہ قرآنی بشارتیں تو فلاں فلاں شرط کے ساتھ مشروط تھیں، بعد میں یہ شرائط (معاذاللہ) ان میں نہیں پائی گئیں لہٰذا یہ کالعدم ہو گئیں۔اگر ایسا ہوتا تو علیم و خبیر، سمیع بصیر، علی کل شئ قدیر رب جلیل کو یہ بشارتیں سنانے کے تکلف کی آخر ضرورت ہی کیا تھی؟

بشارتوں کی دوسری قسم یہ ہے کہ ان میں کسی خاص فرد یا افراد کو ملحوظ نہ رکھا گیا ہو بلکہ مضمون عام ہو۔ اس پر بحث ان شاء اللہ العزیز اگلی قسط میں ہو گی۔

(نویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعض بشارتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کسی خاص فرد، افراد، جماعت یا گروہ کے لئے نہیں ہوتیں بلکہ ان کا مضمون عام ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ الکہف میں ہے۔۔۔ان الذین آمنوا و عملواالصلحت کانت لھم جنت الفردوس نزلا (الکہف 107) "بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئےان کے لئے فردوس کے باغات مہمانی ہوں گے"۔

یہ بشارت پوری امت کے مومنین صالحین کے لئے عام ہے۔ کسی فرد یاافراد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ علیم و خبیر اللہ تعالی کو توخوب معلوم ہے کہ کتنے اور کون سے لوگ اس بشارت کا مصداق ٹھہریں گے لیکن مخلوق کواس کا علم نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ فلاں خاص فرد یا خاص جماعت سے اس بشارت کا وعدہ ہے۔ پس کسی بشارت کے خاص موعود لھم حضرات اور اس بشارت کے عام مصداق لوگوں میں لطیف فرق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئیے۔ وجہ ظاہر ہے کہ موعود لھم لوگ وہی ہو سکتے ہیں جو متعین اور مخصوص ہوں اور نہ صرف انہیں بلکہ اکثر وبیشتر دوسرے لوگوں کو بھی علم ہوتا ہے کہ انہیں متعین کرکے بشارت دی گئی ہے۔ لہٰذا جو بشارت عام ہو اور اس کا مصداق کسی کو متعین کرکے نہ ٹھہرایا گیا ہو تو یہ کہنا کیسے درست ہوگا کہ اس بشارت کا وعدہ فلاں فلاں شخص یا فلاں فلاں جماعت اور گروہ سے ہے، نیز جن بشارتوں کا مضمون عام ہو ان میں متعلقہ شرائط کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا، مثلاً ماں کی خدمت کرنے والوں کے لئے عام بشارت ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے، تو اس طرح کی بشارتوں میں ایمان اور دیگر اعمال صالحہ کی شرط کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔ یہ نہیں کہ غیر مسلم یا مثلاً باپ کا قاتل بھی اس بشارت کا مصداق ہوگا۔۔ اب آیت استخلاف پر پھر غور کیجئیے کہ اس میں کلمہ "منکم" لا کر اللہ

تعالی نے اسے صرف اور صرف ان مومنین صالحین کے لئے مختص کر دیا ہے جو نزول آیت کے وقت ایمان اور اعمال صالحہ کی نعمت سے بہرہ مند تھے۔ چونکہ آیت استخلاف والی نعمتوں کی علت ایمان اور اعمال صالحہ ہے لہٰذا دور نبوی کے بعد بھی جن لوگوں میں یہ علت پائی جائیگی اور علت سے معلول کے ظاہر ہونیکی متعلقہ شرائط بھی موجود ہوں گی تو یہ موعودہ بہا نعمتیں انہیں بھی حاصل ہوں گی اور وہ بھی آیت استخلاف کا مصداق تو ضرور ٹھہریں گے لیکن انہیں اس آیت کا موعود لھم نہیں کہا جائیگا۔ پس جن حضرات نے آیت استخلاف کو صرف دور نبوی تک محدود رکھا انہوں نے اس میں کلمہ منکم کی وجہ سے تخصیص کے پیش نظر ایسا کیا اور جنھوں نے العبرہ للعموم لا لخصوص المورد کے تحت بشارت کے عموم کو پیش نظر رکھا انہوں نے اسے بعد کے ادوار کے لوگوں کے لئے بھی عام رکھا نہ یہ کہ انہوں نے بعد کے کسی خاص فرد یا افراد کو اس کا حتمی موعود لھم ٹھرایا، بالفاظ دیگر کسی بشارت کے موعود لھم لوگ لازما اس بشارت کا مصداق بھی ہوں گے لیکن اشتراک علت کی بنا پر بشارت کا مضمون غیر موعود لھم لوگوں پر بھی صادق آئے تو ظاہر ہے کہ وہ بشارت کا مصداق ہونے کے باوجود اس کا موعود لھم نہیں کہلائیں گے۔ یوں تفسیری اقوال میں اختلاف دراصل حقیقی نہیں بلکہ اعتباری ہونیکی بنا پر محض ظاہری وصوری ہے۔ یہی حال وعیدی مضامین کا بھی ہے۔ جب وعید کسی خاص فرد یا افراد کے لئے ہو تو اس میں بھی لوگوں کے لئے یہ گنجائش نہیں کہ وہ اپنی طرف سے شرائط عائد کریں، مثلا سورہ لہب میں ابولہب کو جو تباہی کی وعید سنائی گئی ہے تو یہ کہنا درست نہیں کہ بشرطیکہ ابولہب توبہ نہ کرے وغیرہ.. کیونکہ ابولہب کی قسمت میں توبہ کرنا اور اسلام قبول کرنا ہوتا تو علیم و خبیر اللہ تعالی اسے مخصوص کرکے وعید ہی کیوں سناتا؟ اس کے برعکس جو وعیدیں عام ہیں ان میں حسب تقاضا شرائط ملحوظ ہوں گی، مثلا متعلقہ لوگوں نے اپنے گناہوں سے توبہ نہ کی ہو یا کسی بھی وجہ سے اللہ تعالی نے انہیں معاف نہ فرمایا ہو تو یہ وعیدیں موثر ہوں گی ورنہ نہیں۔ یہ تو بات ہوئی وعدہ اور وعید کے مضامین کی اب ہم خاص القاب اور

اصطلاحات کی طرف آتے ہیں، مثلا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ کلیم اللہ صرف اور صرف حضرت موسی علیہ السلام کا لقب ہے، چونکہ امت کا طبقاتی تواتر اس کی پشت پر ہے لیکن یہ کہنا ہر گز درست نہیں کہ دیگر انبیاء علیہم السلام لغوی معنی کے اعتبار سے بھی (معاذاللہ ثم معاذاللہ) کلیم اللہ نہیں۔ اللہ تعالی کی طرف سے ملفوظی وحی یقینا اللہ کا کلام ہے اور اس وحی کو پانے والا ہر نبی یقینا کلیم اللہ بھی ہے۔ چنانچہ سورہ الشوری میں ہے.. وماکان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من ورائ حجاب اویرسل رسولا فیوحی باذنہ مایشآء (الشوری 51).. " پس کسی بشر کے لئے ممکن نہیں کہ اللہ سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے یا یہ کہ وہ (فرشتے کو بطور) پیغام رساں بھیجے پھر وہ (نبی پر) اپنے حکم سے جو چاہے وحی کرے"۔

اس آیت میں اللہ تعالی نے سبھی انبیاء کرام کو کلیم اللہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ امت کے طبقاتی تواتر کی رو سے خلفائے راشدین صرف اور صرف پہلے چار خلفاء ہیں لیکن یہ کہنا ہر گز درست نہیں کہ بعد کے دیگر نیک خلفاء مثلا سیدنا حضرت معاویہ رض لغوی معنی کے اعتبار سے بھی خلیفہ راشد نہیں۔ اللہ تعالی نے تو سبھی صحابہ کرام کو راشدون قرار دیا ہے (الحجرات 7) تاہم چونکہ خلافت راشدہ کی اصطلاح خلفاء اربعہ کے لئے باجماع اہل حق مخصوص ہے لہذا از راہ امتیاز سیدنا معاویہ رض کی خلافت کو خلافت عادلہ کہا جائے یا خلفاء اربعہ کی خلافت راشدہ کو خاصہ اور حضرت معاویہ کی خلافت راشدہ کو عامہ کہا جائے تو بالکل درست ہے۔ چونکہ راشدہ کے ساتھ خاصہ یا عامہ کے لاحقہ سے کلام میں طول پیدا ہوتا ہے لہذا اختصار کے پیش نظر خلفاء اربعہ کی خلافت کو راشدہ اور سیدنا معاویہ رض کی خلافت کو عادلہ کہا جاتا ہے۔ پس جس طرح مبہم انداز میں یہ کہنا کہ کلیم اللہ صرف موسی علیہ السلام ہیں درست نہیں کیونکہ سبھی انبیاء کرام کلیم اللہ ہیں اسی طرح مبہم انداز میں یہ کہنا بھی درست نہیں کہ خلفائے راشدین صرف پہلے چاروں خلیفہ ہیں، کیونکہ بعد کے نیک خلفاء بھی راشدین ہیں بلکہ یہ

کہنا چاہیئے کہ امت کے طبقاتی تواتر نے کلیم اللہ کے لقب یا اصطلاح کو حضرت موسی علیہ السلام کے ساتھ اور خلافت راشدہ کی اصطلاح کو پہلے چاروں خلفاء کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ اصطلاحی تخصیص سے دوسروں سے متعلقہ وصف کی لغوی اعتبار سے نفی نہیں ہو جاتی۔

صحابہ کرام رض میں صدیق کا لقب حضرت ابو بکر صدیق کے لئے مخصوص ہے، اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ کوئی اور صحابی صدیقیت کے مقام اور مرتبے کو کبھی پہنچا ہی نہیں۔ فتدبر و تشکر۔ اور ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ کسی کی بھی فضیلت من حیث الکل لی جاتی ہے۔ کیونکہ مفضول اپنی بعض جزئی فضیلتوں کی بنا پر بظاہر افضل سے بڑھا ہوا نظر آتا ہے لیکن حقیقت اس کے بر عکس ہوتی ہے۔ مثلا سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رض کی عسکری خدمات اور شاندار فتوحات کی جزئی فضیلت کو دیکھا جائے تو مثلا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالی عنہ میں تو اس فضیلت کا عشر عشیر بھی نہیں پایا جاتا لیکن حضرت خالد بن ولید نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو ایک مرتبہ کچھ برا بھلا کہا تو اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے اصحاب کو برا نہ کہو۔ تم میں سے اگر کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کر ڈالے تو میرے صحابہ کی خرچ کی ہوئی مد بھر (یعنی تھوڑی سی) گندم یا جو کے برابر کو بلکہ اس کے نصف کو بھی نہیں پہنچ پائے گا۔ (جمع الفوائد جلد دوم حدیث رقم 8547 للشیخین وابی داوود و الترمذی)

بار بار غور کیجئیے کہ یہاں حدیث میں مخاطب حضرت خالد بن ولید ہیں جو خود بھی تو صحابی ہیں لیکن آپ انہیں فرما رہے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن عوف رض جیسے میرے صحابہ کو برا نہ کہو۔ وجہ یہ معلوم ہو رہی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض سابقون اولون اور عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں. .

حضرت خالد بن ولید کی بے مثال شجاعت اور ان کی بے نظیر فتوحات حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض پر محض جزئی فضیلت رکھتی ہیں جو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی جلالت قدر کو ہر گز متاثر نہیں کرتیں

جیسے حضرت داوود اور حضرت سلیمان (علیہما السلام) کی حکومت کا استحکام حضرت موسی علیہ السلام کے مقام کو کم نہیں کرتا اسی طرح خالد بن ولید ہوں یا حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) ان کے جزئی فضائل عشرہ مبشرہ میں شامل صحابہ کرام کے مقام و مرتبہ کو ہرگز کم نہیں کرتے اور کیونکہ خطائے اجتہادی کبھی مفضول کی بجائے افضل سے بھی ہو جاتی ہے، پس حضرت معاویہ رض کے حق میں افراط سے جس طرح حضرت علی رض کے حق میں تفریط درست نہیں اسی طرح حضرت علی رض کے فضائل و مناقب کے پیش نظر کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ وہ حضرت معاویہ رض کے حق میں تفریط سے کام لے۔ فرق مراتب کو ملحوظ نہ رکھنا جہاں پسندیدہ نہیں تو فرق مراتب کی آڑ میں کسی صحابی رسول کے حق میں تفریط بھی ہرگز قابل قبول نہیں ہونی چاہیئے۔

(دسویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیطان انسان کا دشمن ہے، بعض اوقات نیک نیت اور نیک عمل لوگ بھی ایک حد تک غیر شعوری طور پر اس کے فریب میں آجاتے ہیں۔ اگر ہمارے اباجی (سیدنا آدم علیہ السلام) کو اس نے فریب دیا تھا تو ہم اور آپ کس شمار میں ہیں؟ اللہ تعالی ہم سب کو اس کے شر سے محفوظ رکھے اور صحابہ کرام رض کے بارے میں اگر ہم غیر شعوری طور پر بھی افراط و تفریط کا شکار ہوئے ہوں تو اللہ تعالی ہمیں اور ہمارے تمام بھائیوں اور ہمارے بزرگوں سے بھی ایسی فکری لغزشوں پر در گزر فرمائے۔ آمین۔

صحابہ کرام کے بارے میں اس شیطانی فریب کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(الف) مثلاً زید کہتا ہے کہ فلاں فلاں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ صحبت نبوی کی زیادہ مدت حاصل نہیں ہوئی اس لئے ان کی بقول زید پوری قلب ماہیت نہ ہو سکی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود زید کی قلب ماہیت ہوئی ہے یا نہیں؟ اگر وہ دعوی کرے کہ اس کی قلب ماہیت ہو چکی ہے تو زید کے اپنے مفروضے کے تحت قلب ماہیت کے لئے مثلاً دس سال کی صحبت نبوی درکار ہو تو جسے پانچ سال کی صحبت حاصل ہوئی اس کی قلب ماہیت پچاس فیصد ہوئی، اور جسے دو سال کی صحبت میسر آئی اس کی قلب ماہیت بیس فیصد ہوئی، اور جسے زید کی طرح ایک ثانیے (سیکنڈ) کے کروڑویں حصے کی بھی صحبت نبوی حاصل نہ ہوئی، خود زید کے اپنے مفروضے کے تحت اس کی قلب ماہیت صفر فیصد ہوئی۔ پس دوسری شق خود بخود ثابت ہو گئی کہ زید کے اپنے ہی مفروضے کے تحت زید کی قلب ماہیت سرے سے ہی نہیں ہوئی۔ اس صورت میں کون عقلمند زید کی صحابہ کرام رض کے متعلق بیہودہ رائے کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گا؟

(ب) اور مثلاً زید کہتا ہے کہ صحابہ کرام رض (معاذاللہ) معیار حق نہیں ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خود زید بھی معیار حق ہے یا نہیں؟ اگر وہ معیار حق ہونے کا دعوی کرے تو اس کا یہ دعوی قطعاً قابل قبول نہیں ہو سکتا کیونکہ جب اس کے بقول صحابہ کرام تک معیار حق نہیں ہیں تو زید کیسے معیار حق بن گیا؟ پس دوسری شق خود بخود ثابت ہو گئی کہ زید خود اپنے مفروضے کے مطابق معیار حق نہیں ہے۔ حق کا متضاد لفظ باطل اور ضلال (گمراہی) ہے۔ قرآن کریم میں بھی ہے : فماذا بعد الحق الا الضلال " تو حق کے بعد سوائے گمراہی کے اور ہے ہی کیا؟ " جب زید خود اپنے ہی دعوے کی روشنی میں معیار حق نہ ہوا تو لازما معیار ضلال ہوا، گو وہ زبان سے اس کا اعتراف نہ کرے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یہ کہے کہ میں صحتمند نہیں ہوں تو دوسری شق یعنی اس کا بیمار ہونا خود بخود ثابت ہو گئی گو وہ زبان سے یہ نہ کہے کہ میں بیمار ہوں۔ جب زید معیار ضلال ٹھہرا تو اس کی رائے تو کسی عام شخص کے بارے میں بھی معتبر نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ صحابہ کرام کے متعلق اس کی لغویات کو کوئی وزن دیا جائے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ ہر باطل گو خطا بھی ہے لیکن ہر خطا کو باطل نہیں کہا جا سکتا' ورنہ اجتہادی مسائل میں خطا کرنے والے مجتہد کو بموجب حدیث اکہرے اور خطانہ کرنے والے کو دوہرے اجر کا مستحق قرار نہ دیا جاتا۔ کیا اہل باطل بھی اجر کے مستحق ہوا کرتے ہیں؟ پس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دیگر افراد کے معصوم عن الخطا نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ بشمول صحابہ کرام ان میں کوئی بھی معیار حق نہیں ہے۔ امت محمدیہ میں بے شک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعلی ترین اور اولین معیار حق ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحابہ کرام معیار حق نہیں رہے بلکہ کتاب اللہ (قرآن کریم) کی نظری رہنمائی کے ساتھ ساتھ رجال اللہ کی عملی رہنمائی بھی لوگوں کو ہمیشہ حاصل رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں جن منعم علیہم (انعام یافتہ) لوگوں کے صراط مستقیم پر چلائے رکھنے کی ہمیں دعا سکھائی گئی ہے ان میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے علاوہ صدیقین، شہداء اور صالحین بھی شامل ہیں۔ حالانکہ حضرات انبیاء علیہم السلام تو

بالاتفاق معصوم عن الخطا ہیں لیکن منعم علیہم (انعام یافتہ) لوگوں کے باقی تینوں گروہ معصوم عن الخطا نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا راستہ صراط مستقیم ہے۔ پس کوئی زمانہ بھی ایسے رجال اللہ سے خالی نہیں رہتا۔ یہی لوگ معیار حق ہیں ورنہ انہیں اہل حق اور صراط مستقیم پر چلنے والا کیسے کہا جا سکتا ہے؟ یہاں کچھ لوگوں نے افراط سے کام لیتے ہوئے یہ سمجھ لیا کہ دنیا میں ہر زمانے میں کسی زندہ امام معصوم کا وجود ناگزیر ہے تو کچھ لوگوں نے تفریط سے کام لیتے ہوئے ناحق یہ سمجھ لیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی بھی معیار حق نہیں۔ جس طرح انبیاء علیہم السلام کے معیار حق ہونے کے باوجود ان کے مراتب اور درجات باہم متفاوت ہیں یکساں نہیں، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے بعد دیگر اہل حق اور معیار حق لوگوں کے مراتب و درجات بھی یکساں نہیں کیونکہ کمالات کے بھی بے انتہا مراتب ہیں۔ اہل حق کے باہم اختلافات سے بھی ان کا معیار حق ہونا متاثر نہیں ہوتا۔ زید اگر یہ کہے کہ جنگ جمل کے معاملے میں حضرت علی رض معیار حق ہیں یا حضرت عائشہ رض؟ یا جنگ صفین کے معاملے میں حضرت علی رض معیار حق ہیں یا حضرت معاویہ رض؟ تو ہم زید سے یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ بنی اسرائیل کی گئوسالہ پرستی کے معاملے میں حضرت موسی علیہ السلام نے حالت غضب میں حضرت ہارون علیہ السلام کو سر اور داڑھی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا تھا تو کیا حضرت موسی علیہ السلام معیار حق تھے یا حضرت ہارون علیہ السلام؟۔ یہاں تحقیقی جواب یہ ہے کہ غیر معصوم کی اگر کوئی غلطی یقینی دلائل سے ثابت ہو جائے تو غلطی میں اس کی اتباع نہیں کی جائیگی، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ سرے سے معیار حق ہی نہیں رہا۔ اسی طرح معصوم عن الخطا یعنی پیغمبر کی کسی خطائے اجتہادی کا یقینی و قطعی علم ہو جائے تو اس میں پیغمبر کی اتباع بھی درست نہ ہو گی مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے متوفی کافر بیٹے کے لئے اللہ تعالی سے دعا کرنا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی اس کے مخلص بیٹے کی دلجوئی کے لئے نماز جنازہ پڑھانا وغیرہ ایسی مثالیں ہیں

جن کی اتباع جائز نہیں۔ ان کی ایسی اجتہادی خطاوں اور ان خطاوں میں ان کی عدم اتباع سے یہ نتیجہ اخذ کرنا حماقت ہے کہ پیغمبر (معاذاللہ) سرے سے معیار حق ہی نہیں رہا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کو معصوم عن الخطا اس معنی میں کہا جاتا ہے کہ گناہ کے تو وہ قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ بتقاضائے بشریت وہ کبھی خطائے اجتہادی کا شکار ہوں تو لازماً انہیں اس پر اطلاع اور خطا کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ دیگر افراد امت کے لئے خطائے اجتہادی سرے سے قابل مواخذہ ہی نہیں اور اللہ کے نیک بندے گناہ پر اصرار کرتے ہی نہیں بلکہ ایسے غیر معصوم حضرات گناہ کو گناہ سمجھتے اور اس سے توبہ کرتے ہیں، تو یہاں بھی وہ دوسروں کے لئے توبہ کے لحاظ سے معیار حق ٹھہرتے ہیں۔ جس طرح پیغمبر کی اجتہادی خطا میں اس کی اتباع جائز نہیں لیکن اس سے اس کا معیار حق ہونا متاثر نہیں ہوتا اسی طرح غیر معصوم کا گناہ یا اس کی کسی خطائے اجتہادی کا یقینی علم حاصل ہو جائے تو اس گناہ اور خطائے اجتہادی میں اس کی اتباع نہیں ہوگی، لیکن اس سے اس کا معیار حق ہونا بھی متاثر نہیں ہوگا۔

پس یہاں اصل حقیقت یہ ہے کہ صحیح العقیدہ ادنی سے ادنی مسلمان بھی اپنی حیثیت اور مقام کے مطابق یوں معیار حق ہے کہ اگر غیر مسلم اس کی پیروی کرتے ہوئے کفر چھوڑ کر اسلام قبول کریں اور بالفرض فسق و فجور کے باوجود ان کی موت اسلام پر ہی واقع ہو تو بھی اللہ چاہے اسے ویسے ہی معاف فرمادے ورنہ زود یا بدیر جہنم کے دائمی عذاب سے تو وہ نجات پا ہی جائیگا۔ پس کسی کا معیار حق ہونا اور بات ہے اور معصوم عن الخطا ہونا بالکل دوسری بات ہے، یعنی ہر معصوم عن الخطا یقینا معیار حق بھی ہے لیکن کسی کا معیار حق ہونا اس امر کو مستلزم نہیں کہ وہ لازما معصوم عن الخطا بھی ہو.. فتدبر و تشکر

(گیارہویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(ج) مثلاً زید کہتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ باغی تھے یا ان کی حکومت سلطان جور تھی، وغیرہ.. تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زید کو اپنے متعلق یہ قطعی یقین ہے کہ اس کی موت ایمان اور اعمال صالحہ پر ہوگی؟ اگر اسے یقین ہے تو اس کے متعلق وحی تو موجود نہیں۔ یقیناً اس نے اپنی عقل سے فیصلہ کیا ہوگا۔ عقل میں بالاتفاق خطا کا احتمال ہے۔ لہٰذا دوسری شق ہی صحیح ہو سکتی ہے کہ زید کو اپنی عاقبت کا یقینی علم نہیں۔ صرف اللہ ہی کو اس کا یقینی علم ہے۔ اس لئے زید اپنے علم کے اعتبار سے مجہول العاقبہ ہوا، گو شیطان نے اسے معلوم العاقبہ ہونے کا فریب دے رکھا ہو۔ ادھر تمام صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) معلوم العاقبہ ہیں کیونکہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا واضح اعلان ہے کہ وہ اپنے نبی اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا: یوم لایخزی اللہ النبی والذین آمنوا معہ۔ پس دیگر صحابہ کرام کی طرح حضرت معاویہ رض کے حسن عاقبت کا یقینی علم قرآن کریم سے حاصل ہو گیا۔ اگر کہا جائے کہ حضرت معاویہ رض صحابی ہی نہیں ہیں بلکہ (معاذاللہ) منافق تھے تو سورہ تحریم میں مذکورہ مضمون والی آیت کے ساتھ فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا کہ: "اے نبی! تو کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کر اور ان پر سختی بھی کر۔ بے شک ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز ہرگز حضرت معاویہ رض پر کوئی سختی نہیں فرمائی بلکہ الٹا انہیں اپنا کاتب وحی مقرر فرمایا۔ ان کے والد حضرت ابوسفیان رض کے گھر کو دارالامان قرار دیا۔ غزوہ حنین واوطاس کے بے شمار مال غنیمت سے بظاہر اصل مستحقین انصار مدینہ کو کچھ بھی نہیں دیا اور مہاجرین کو بھی بہت کم دیا اور ان غنیمتوں کا بیشتر حصہ نو مسلم قریش مکہ وغیرہ مولفتہ القلوب کو دیا۔

خود حضرت ابوسفیان رض اور ان کے خاندان کے گھر کو بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اموال غنیمت سے بھر دیا۔ پورے خاندان کا آپ نے بے حد اعزاز و اکرام فرمایا۔ اگر کہا جائے کہ منافقین پر سختی کرنے کا موقع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش نہیں آیا تھا تو اللہ تعالی پر الزام آئے گا کہ اسے پتہ بھی تھا کہ منافقین پر سختی کرنے کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سرے سے ضرورت ہی پیش نہیں آئیگی پھر بھی اس نے خاص نبی ہی کو مخاطب کرتے ہوئے منافقین پر سختی کرنے کا حکم (معاذاللہ) خوامخواہ اور بلا ضرورت دے ڈالا اور آپ کو یہ بھی نہ بتایا کہ جس خاندان پر آپ اتنی عنایات فرمارہے ہیں یہ خاندان تو (معاذاللہ) فی الحال منافق ہے یا آپ کے بعد (معاذاللہ) باغی اور مرتد ہو جائے گا۔ اللہ کا کلام ہر عیب سے پاک ہے۔ پس جب زید مجہول العاقبہ ہونے کے باوجود معلوم العاقبہ اصحاب رسول کو (معاذاللہ) باغی یا فاسق وغیرہ قرار دے گا تو یقینا اپنی حد سے تجاوز کرے گا۔ حد سے تجاوز ہی تو ظلم اور بغاوت ہے۔ پس زید خود ظالم اور باغی ثابت ہوا اور اس کے ظلم اور اس کی بدظنی کا شکار صحابہ کرام رض مظلوم ہوئے۔ اگر ان مظلوم صحابہ کرام نے مثلا حضرت معاویہ رض نے قیامت کے دن ایسے ظالموں کو خدانخواستہ معاف نہ کیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ خصوصا جب کہ زید کے دل میں کسی بھی صحابی رسول کے خلاف بغض و نفرت بھی ہو محض فکری لغزش نہ ہو۔ حضرت معاویہ رض کا حلم اور بردباری ضرب المثل ہے۔ ظن غالب ہے کہ وہ ایسی فکری لغزش والوں کو معاف کر دیں گے لیکن جن کے دل میں ان کے خلاف بغض ہے تو ممکن ہے کہ حضرت معاویہ رض یہ کہیں : "اے اللہ ! اگر حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے مجھے بالفرض باغی کہا تھا تو وہ مقام و مرتبے میں مجھ سے بلند اور وصف صحابیت میں میرے شریک ہیں جسطرح حضرت موسی علیہ السلام مقام و مرتبے میں حضرت ہارون علیہ السلام سے بلند اور وصف نبوت میں ان کے شریک ہیں، تو جسطرح حضرت موسی علیہ السلام کا حضرت ہارون علیہ السلام سے سختی سے پیش آنا اور انہیں ریش مبارک سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا دوسروں کے لئے قطعاً یہ

جواز پیدا نہیں کرتا کہ وہ بھی حضرت ہارون علیہ السلام سے اسی طرح کا رویہ اختیار کریں اسی طرح میرے بھائی حضرت علی رض کو تو مجھے باغی وغیرہ کہنے کا حق ہو سکتا ہے لیکن اپنی حیثیت اور انجام سے بے خبر بعد کے لوگ مجھے باغی قرار دینے والے کون ہوتے ہیں؟ اگر میں انہیں واقعی باغی اور فاسق و فاجر نظر آ رہا تھا تو یہ برادران یوسف کے حال پر ہی غور کر لیتے۔ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکا۔ اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام کو دھوکہ دیا اور ان سے جھوٹ بولا۔ سالہاسال تک انہیں پریشان کئے رکھا۔ انہیں رلائے رکھا کہ حتی کہ ان کی بینائی متاثر ہوئی۔ ان کے ظاہری یہ سنگین جرائم عام لوگوں کے خلاف نہیں بلکہ اپنے حقیقی باپ اور حقیقی بھائی کے خلاف سرزد ہوئے۔ پھر عام بھائی یا عام باپ کے خلاف نہیں بلکہ نبی بھائی اور نبی باپ کے خلاف تھے۔ انہوں نے بھائی کی اخوت اور باپ کی ابوت کا لحاظ تو کیا کرنا تھا، نبوت جیسے عظیم اور ارفع مقام کو بھی انہوں نے سرے سے فراموش کر دیا تھا۔ لیکن اے اللہ! جب تو نے انہیں معاف فرمادیا اور ان کی مغفرت کا ذکر قرآن کریم میں یوں فرمادیا کہ ان کے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں معاف فرمادیا اور ان کے والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے لئے استغفار کیا (جو اللہ کے حکم اور اجازت کے بغیر ممکن نہیں) تو کسی کے لئے بھی تو نے ان کے خلاف لب کشائی کی گنجائش نہ چھوڑی۔ کسی کے لئے یہ جواز نہ چھوڑا کہ وہ عدل عدل کی دہائی دے اور اس طرح کے تبصرے کرے کہ اللہ تعالی کے ہاں سکھاشاہی نہیں ہے۔ اے اللہ! کسی سے عدل کرنا ہو یا کسی کو معاف فرمانا ہو تو ہرگز تو لوگوں سے پوچھ کر ایسا کرنے کا پابند نہیں ہے۔ اسی طرح اے اللہ! جب تو نے تمام اصحاب رسول کی مغفرت فرمادی اور قرآن کریم میں اس مضمون کو جابجا مختلف طریقوں سے بیان فرمادیا اور یہ بھی اعلان فرمادیا کہ اللہ بروز قیامت نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا، تو کسی کو کیا حق تھا کہ وہ تجھے بزعم خویش انصاف کا سبق پڑھانے لگے اور میرے خلاف یا کسی بھی صحابی رسول کے خلاف بغض و نفرت رکھتا ہوا

لب کشائی کرتا پھرے؟اے اللہ ! حقوق العباد میں جن بندوں کا حق ضائع ہوا ہو، تو اگر چاہے تو اپنی رحمت کاملہ سے ان کا ضائع کردہ حق ہی پورا نہیں کر دیتا بلکہ ان کے دل میں حق ضائع کرنے والوں کے خلاف نفرت کی بجائے محبت پیدا فرما کر انہیں اس بات پر آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ حق ضائع کرنے والوں کو خوشی خوشی معاف کر دیں۔ مثلاً غزوہ احد میں میدان جنگ چھوڑنے والوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ضائع کیا۔ ان کی وجہ سے آپ کو سخت جسمانی اذیت بھی اٹھانا پڑی لیکن اے اللہ ! اس کے باوجود تو نے اپنے پیغمبر کے دل کو اپنے ان اصحاب کے لئے نرم کر دیا تاکہ اللہ کے بعد اس کا رسول بھی ان لوگوں کو معاف کرے تو ہنسی خوشی معاف کرے۔ اور پھر جن مشرکین نے غزوہ احد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو خصوصاً تکلیف پہنچائی تھی ان کے متعلق بھی اے اللہ ! تو نے اپنے پیغمبر کے دل کو نرم کر دیا اور پیغمبر علیہ السلام نے فتح مکہ کے موقع پر ان لوگوں کو ایسے ہی فراخ دلی سے معاف فرما دیا جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو معاف فرما دیا تھا اور ان سب قریش مکہ کو اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی سوائے گنتی کے چند لوگوں کے جو اسی دوران مر کھپ گئے۔ اے اللہ ! جب یہ واضح ہے کہ تیرے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اصحاب سے بغض و نفرت رکھنے والے اور انہیں باغی و فاسق قرار دینے والے خود ظالم ہیں تو ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما"۔

ممکن ہے کہ اس مشکل گھڑی میں زید رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی امید رکھے لیکن اسے آپ سے یہ سننا پڑے: " منافقین میرے اصحاب پر غصے سے انگلیاں کاٹتے تھے تو مجھے اللہ تعالی نے ان کے لئے یوں بد دعا کرنے کا حکم دیا: موتوا بغیظکم۔ " تم اپنے غصے میں مر جاو" تو جو میرے اصحاب کا دشمن ہو اس کے لئے مجھے یہ حکم ہے کہ میں اس کے متعلق بد دعا کروں نہ کہ سفارش کروں۔ اللہ تعالی اس مشکل گھڑی سے ہمیں بچائے۔ آمین۔

(بارھویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حسن عاقبت متفق علیہ ہے، لہٰذا ہمارے علم کے لحاظ سے ان کا معلوم العاقبہ ہونا سرے سے اختلافی ہے ہی نہیں۔ جہاں تک صحابہ کرام رض کا تعلق ہے تو ان کی تین جماعتوں مہاجرین، انصار اور مولفتہ القلوب کے حسن عاقبت کی چونکہ یقینی اور محکم خبریں قرآن کریم نے دی ہیں لہٰذا ہمارے علم کے اعتبار سے یہ خوش نصیب حضرات بھی یقینا معلوم العاقبہ ہیں۔ اگر معلوم العاقبہ لوگوں کی طرف منسوب خلاف شریعت اعمال وافعال کے متعلق اخبار و روایات کی صحت سو فیصد یقینی بھی ہو تو بھی ان حضرات سے بدگمانی اور شکایت کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔ اگر ایسی خبروں کا صحیح ہونا ہی محل نظر ہو تو معلوم العاقبہ حضرات کے متعلق بدگمانی اور شکایت تو بطریق اولی سخت ناپسندیدہ بلکہ گناہ کبیرہ ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کے بظاہر انتہائی خلاف شریعت کاموں پر حضرت موسی علیہ السلام کو جو اشکالات پیش آئے تو وہ اس لئے قطعاً بے وزن اور کالعدم قرار پائے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا اللہ تعالی نے واضح فرمادیا۔ جب معلوم العاقبہ لوگوں کے خلاف حضرت موسی علیہ السلام جیسی اولوالعزم اور عظیم المرتبت شخصیت کے اشکالات بھی کالعدم ٹھرے تو ایسے حضرات کے بارے میں من وشما کی کیا حیثیت ہے کہ ہم ان کے حقیقی یا مفروضہ خلاف شریعت کاموں کی شماریات مرتب کریں؟ اگر کسی معلوم العاقبہ کے خلاف کسی بدنصیب کے قلب ماوءف میں بغض و عناد کارفرما ہو تو ایسے ملحدین تو انبیاء علیہم السلام کے خلاف بھی انتہائی سنگین جرائم منسوب کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ کون سا ایسا گناہ ہے جو یہود و نصاری نے حضرات انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب نہیں کیا؟ پس اگر کسی خاص شخص

یا گروہ کے مغفور و مرحوم ہونیکی اطلاع اللہ اور اس کے رسول نے دی ہو اور یہ خبر قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ ہو تو ایسے لوگ بظاہر کتنے ہی خلاف شرع کام کرتے نظر آئیں تو بھی ان کا انجام بہر حال اچھا ہوگا، ورنہ اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب والشہادہ ہے ان کے حسن عاقبت کی خبریں ہی ہمیں کیوں دیتا؟ غور کیجئیے. برادران یوسف علیہ السلام کے یقینی جرائم کے مقابلے میں صحابہ کرام کے حقیقی یا مفروضہ جرائم تو عشر عشیر کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو لاتثریب علیکم الیوم کی بشارت سنائی تھی تو بعینہ یہی بشارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فتح مکہ کے موقع پر اہل مکہ کو سنائی تھی۔ اگر برادران یوسف علیہ السلام مغفور و مرحوم ہیں تو سید المرسلین سے عفو و در گزر کی بشارت پانے والے مولفتہ القلوب اہل مکہ بھی یقینا مغفور و مرحوم ہیں۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ قرآن کریم سے جن اصحاب رسول کے حسن عاقبت کی یقینی خبریں ہمیں حاصل ہوتی ہیں تو ان کا تعلق صرف اور صرف مہاجرین وانصار اور فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرنے والے مولفتہ القلوب اہل مکہ سے ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد صحابہ کرام کی مذکورہ بالا تینوں جماعتوں میں سے کوئی ایک فرد بھی ہر گز (پھر دہرایئے) ہر گز مرتد نہیں ہوا۔ سورہ المائدہ میں ہے :- یا ایھاالذین آمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشآء واللہ واسع علیم (المائدہ54)۔ " اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ عنقریب ایسے لوگ لائے گا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے، ایمان والوں پر نرمی کرنیوالے ہوں گے، کافروں پر سخت ہوں گے، اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے وہ اسے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا ہے سب کچھ جاننے والا ہے "۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد فتنہ ارتداد نمودار ہوا تھا یا نہیں؟ اگر نہیں تو ارتداد کے حوالے سے مہاجرین و انصار اور مولفتہ القلوب پر کوئی اعتراض ہی نہ رہا۔ اگر فتنہ ارتداد ہوا تھا اور یقینا ہوا تھا تو مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت ارتداد کی روشنی میں کیا اس فتنے کو کچلنے والے اور مانعین زکوہ اور جھوٹے مدعیان نبوت کو ان کے منطقی انجام تک پہنچانے والے ان مہاجرین و انصار اور مولفتہ القلوب کے علاوہ کون لوگ تھے؟؟ اور کیا اللہ تعالی نے آیت میں ان لوگوں کو اپنا محبوب قرار نہیں دیا؟ کیا آیت کی رو سے ان پر اللہ تعالی کا خاص الخاص فضل نہیں تھا؟ آیت کے آخر میں اللہ تعالی نے اپنے اسمائے حسنی "واسع اور علیم" کا جو ذکر فرمایا ہے تو کیا یہ حضرات اللہ تعالی کی وسعت مغفرت و رحمت میں سما نہیں گئے؟ اور کیا اللہ تعالی کو ان کے ماضی، حال اور مستقبل کا پورا پورا علم نہیں تھا؟ کیا اللہ کو معلوم نہیں تھا کہ بعد میں مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان جنگ ہو گی؟ ہر عقل سلیم رکھنے والا شخص یہی جواب دے گا کہ مہاجرین و انصار اور فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرنے والے مولفتہ القلوب اہل مکہ یقینا اللہ تعالی کے محبوب ہیں۔ ان پر اللہ تعالی کا خاص الخاص فضل و کرم ہے۔ اللہ تعالی کی وسعت مغفرت و رحمت نے انہیں اپنے اندر پوری طرح سمو لیا ہے اور یہ کہ اللہ تعالی کو معلوم تھا کہ بعد میں مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان جنگ بھی ہو گی، تاہم ان میں خود صحابہ کرام کی بہت بڑی اکثریت شامل نہیں ہو گی۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو ان جنگوں میں شہید ہونیوالے صرف سو صحابہ کرام کے اسمائے گرامی ہی مستند حوالوں سے پیش کر دے۔ اللہ تعالی کو چونکہ خانہ جنگی کا علم تھا اسی لئے سورہ الحجرات میں فرمایا کہ "کہ اگر مومنین کی دو جماعتوں کے درمیان جنگ ہو جائے تو وہ بھی باہم بھائی بھائی ہیں، تم ان میں صلح کروادیا کرو۔ (الحجرات 9-10)۔ سب جانتے ہیں کہ صلح کرانے کا یہ عظیم الشان شرف اور مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگی بشارت کے عین مطابق آپ کے محبوب نواسے حضرت سیدنا حسن رضی اللہ تعالی عنہ کو حاصل

ہوا۔ اور آپ نے ان دو جماعتوں کے مسلمانوں کو ہی دو عظیم جماعتیں قرار دیا۔ بالفرض اس صلح کے باوجود اگر بعض لوگوں کے دلوں میں باہم کچھ غیر اختیاری رنجش باقی رہ بھی گئی ہو کیونکہ بعض اوقات قلبی کیفیات پر انسان کو اختیار نہیں ہوتا، تو اہل جنت کے متعلق اللہ تعالی کا سورہ الحجر میں ارشاد ہے:- ونزعنا مافی صدورھم من غل اخوانا علی سرر متقبلین (الحجر 47)۔ "اور ہم ان کے سینوں میں جو بھی کینہ ہے اسے نکال باہر کریں گے، وہ بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔" اور سورہ الاعراف میں ہے: ونزعنا مافی صدورھم من غل تجری من تحتھم الانھار۔ (الاعراف 43)۔ "اور ان کے سینوں میں جو بھی کینہ ہوگا ہم اسے نکال باہر کریں گے اور ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی" سورہ الحشر میں اللہ تعالی نے مہاجرین و انصار کی بے حد مدح فرمائی، پھر بعد میں آنیوالوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ وہ یوں دعا کیا کریں گے کہ اے ہمارے رب ! ہمیں بھی بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں ان ایمان والوں کے لئے کینہ نہ رکھنا۔ اے ہمارے رب ! بے شک تو بڑا ہی مشفق اور مہربان ہے۔ (الحشر 8-10)۔ یعنی صحابہ کرام رض معصوم عن الخطا نہیں، ان سے گناہ بھی صادر ہو سکتا ہے، لیکن ان کے گناہوں کی فہرست تیار کرنے کی بجائے ہمیں اپنے لئے بھی اور ان کے لئے بھی استغفار کا حکم ہے۔ پھر سوچ لیجئیے کہ صحابہ کرام کے مفروضہ یا حقیقی جرائم برادران یوسف علیہ السلام کے حقیقی جرائم کا عشر عشیر بھی نہیں اور یہ بھی سوچ لیجئیے کہ اگر صحابہ کرام میں کسی بھی طرح کے محض انتظامی اور سیاسی نوعیت کے اختلافات پیدا ہی نہ ہوتے تو ان کے خلاف دلوں میں کینہ رکھنے کا کسی کو کوئی سبب ہی کیسے ملتا؟ اور یہ بھی سوچ لیجئیے کہ اہل حق وہی ہیں جن کے دلوں میں سورہ حشر کے متعلقہ مضامین کی رو سے کینہ نہیں بلکہ وہ تو اس کینہ سے بچنے کی دعا مانگتے رہتے ہیں۔ وہ دعا جو خود اللہ تعالی نے ہی انہیں سکھائی ہے۔ عیاں را چہ بیاں

(تیرھویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جس فتنہ ارتداد کی قرآن کریم میں سورہ مائدہ میں خبر دی گئی اس کا مصداق مہاجرین و انصار اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے مولفتہ القلوب ہر گز نہیں ہیں، بلکہ انہی حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کی سربراہی میں فتنہ ارتداد کو کچلا تھا۔ قرآن کریم نے ان مرتدین کے غلبے کی نہیں بلکہ مغلوب ہونیکی خبر دی گئی ہے۔ چنانچہ سورہ مائدہ میں ہے کہ " اے ایمان والو ! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو عنقریب اللہ ایسے لوگ لائے گا کہ وہ

(اللہ) ان سے محبت کرے گا اور وہ اس (اللہ) سے محبت کریں گے، وہ مومنین کے لئے نرم اور کافروں پر سخت ہوں گے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے وہ عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور جاننے والا ہے۔ " گو جملہ شرطیہ میں موجود شرط و جزا کا خارج میں وجود اور ظہور ہر حال میں ضروری نہیں ہوا کرتا لیکن بعد میں اگر خارج میں اس کا ظہور ہو جائے تو یہ کہنا بالکل حق بجانب ہوگا کہ اس جملہ شرطیہ سے مستقبل میں ظاہر ہونیوالے متعلقہ واقعہ کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے فوراً بعد فتنہ ارتداد نمودار ہوا۔ مخالفین زکوٰہ اور نبوت کے جھوٹے دعوے دار ظاہر ہوئے۔ پس خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رض اور ان کا دل و جان سے ساتھ دیکر فتنہ ارتداد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے والے صحابہ کرام ہی وہ حضرات ہیں جن کے اصاف حمیدہ سورہ مائدہ کی آیت ارتداد میں مذکور ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ فتنہ ارتداد کا آغاز خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری ایام میں ہو چکا تھا۔ اسود عنسی، مسیلمہ کذاب اور طلیحہ اسدی نے نبوت کا جھوٹا دعوی کر دیا تھا۔ اسود عنسی کی

سر کوبی کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رض کو مامور فرمایا تھا۔ ان کے لشکر میں ایک شخص فیروز نے اسود عنسی کو قتل کر ڈالا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ وحی الہی اس کے قتل کی اطلاع بھی مسلمانوں کو سنادی تھی۔ مسیلمہ کذاب حضرت ابوبکر صدیق رض کے دور خلافت میں جہنم رسید ہوا۔ اس کے خلاف حضرت ابوبکر رض نے حضرت خالد بن ولید رض سے لشکر کشی کرائی تھی اور یہ حضرت وحشی رض کے ہاتھوں مقتول ہوا تھا۔ طلیحہ اسدی کے فتنے کا بھی ابوبکر صدیق رض کے حکم سے حضرت خالد بن ولید نے ہی قلع قمع کیا تھا۔ طلیحہ میدان جنگ سے بھاگ گیا تھا بعد میں تائب ہو گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد فتنہ ارتداد میں شدت پیدا ہوئی۔ حرمین شریفین اور بحرین کے مضافات میں واقع شہر جواثی کے سوا اکثر علاقوں کے لوگ مرتد ہو گئے اور بعض لوگوں نے زکوہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس فتنے کا حضرت ابوبکر صدیق رض نے سختی سے قلع قمع کیا اور معمولی سے تساہل کو بھی برداشت نہیں کیا۔ تمام صحابہ کرام رض نے آپ کا جوش وخروش سے ساتھ دیا اور آپ کے اس کارنامے کو تمام صحابہ نے بڑی عزت کی نظر سے دیکھا۔ جب تک فتنہ ارتداد ظاہر نہیں ہوا تھا اس وقت تک پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ اس آیت میں کس جماعت کی تعریف ہو رہی ہے مگر اس فتنے کے ظہور کے بعد اور صدیق اکبر کے ذریعے اس کے عملی استیصال کے بعد واضح ہو گیا کہ صدیق اکبر رض اور آپ کے رفقا کی جماعت ہی وہ جماعت ہے جس کے اوصاف مذکورہ آیت میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے محبوب ہیں اور اللہ ان کا محبوب ہے۔ پس اس آیت سے حضرت ابوبکر صدیق رض کی خلافت کے برحق ہونیکا بھی یقینی و قطعی علم حاصل ہو گیا۔ اور ان کے خلاف تمام مطاعن از خود کالعدم ہو گئے۔ اگر کہا جائے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے حق میں ہے کہ انہوں نے اپنے زمانہ خلافت میں مرتدوں سے جنگ کی ہے تو جواب یہ ہے کہ حضرت علی رض کا اہل شام کے متعلق یہ فرمان بھی نہج البلاغہ میں موجود ہے جس میں صاف وضاحت اس امر کی ہے کہ اہل شام مومن بلکہ

مومن کامل ہیں۔ حضرت علی رض نے اس مضمون کا گشتی مراسلہ اپنے علاقوں میں بھیجا تھا:- " یعنی ہمارے معاملے کی ابتدایوں ہوئی کہ ہم میں اور اہل شام میں مقابلہ ہوااور ظاہر ہے کہ ہمارااور ان کا خدا ایک اور ہمارااور ان کا نبی ایک اور ہماری اور ان کی دعوت اسلام ایک ہے۔ اللہ پر ایمان رکھنے میں اور اس کے رسول کی تصدیق میں نہ ہم ان سے کسی زائد چیز کا مطالبہ کرتے ہیں اور نہ ہی وہ ہم سے کسی زائد چیز کا مطالبہ کرتے ہیں تو معاملہ ایک ہی ہے سوائے اس کے کہ خون عثمان کے معاملے میں ہمارا اختلاف ہوا ہے اور ہم اس (قتل عثمان) سے بری ہیں"۔

جنگ جمل کے متعلق مورخین نے تصریح کر دی ہے کہ یہ جنگ فتنہ جو لوگوں کی شرارت کی وجہ سے ہوئی ورنہ فریقین میں مصالحت ہو چکی تھی۔ اس جنگ پر فریقین کو شدید صدمہ ہوا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنھا کی شان میں بد کلامی کرنیوالے لوگوں کو حضرت علی رض نے کوڑے لگوائے۔

حضرت زبیر رض کے قاتل عمرو بن جرموز کو آپ نے جہنم کی بشارت سنائی وغیرہ سب امور ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ اور دیگر اصحاب رسول کو جو حضرت عائشہ رض کی فوج میں شامل تھے، حضرت علی رض مومن کامل گردانتے تھے۔ خوارج سے حضرت علی رض کی جنگ نہروان ہوئی۔ خوارج کی گمراہی اگرچہ دینی گمراہی ہے لیکن حضرت علی رض نے انہیں ہرگز کافر یا مرتد قرار نہیں دیا ورنہ آپ بچے کھچے خوارج کا بھی مکمل قلع قمع کرتے۔ ان کے خلاف آپ نے جنگ بھی مجبوراً کی جبکہ وہ بار بار منع کرنے کے باوجود ناحق قتل وغارت سے باز نہیں آتے تھے۔ آپ نے ان میں سے کسی مرد کو غلام یا عورت کو لونڈی نہیں بنایا نہ ان کے اموال کو مال غنیمت قرار دیا۔ نیز آیت ارتداد میں خطاب حاضرین سے ہے جبکہ اس وقت روئے زمین پر خوارج تھے ہی نہیں۔ لہٰذا آیت کا تعلق خوارج کی گمراہی سے نہیں۔

خوارج اسلام کی راہ سے یوں نکل گئے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ لیکن ان کی یہ گمراہی ضلال بعید نہیں جو کفر تک پہنچ جائے۔ نیز اگر تسلیم کر لیا جائے کہ (معاذاللہ) خلفائے ثلاثہ اور ان کے ساتھی مرتد تھے تو

حضرت علی رض نے ان کے خلاف جنگ کیوں نہیں کی حالانکہ آیت کے مضمون سے واضح ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت جو مسلمان بھی موجود تھے ان میں سے جب بھی کوئی مرتد ہوگا تواس سے قتال ضرور ہوگا" تو حضرت علی رض بعض مرتدین سے تو قتال کریں اور بعض سے قتال تو ایک طرف رہا، انہیں مفید مشورے دیں اور اپنے دور خلافت میں ان کے کاموں مثلاتراویح کا اجرا، قرآن کریم کا لغت قریش میں پھیلانا، اموال فے اور باغ فدک میں ان کے طرز عمل وغیرہ کو بحال رکھیں تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت علی رض نے اس آیت پر عمل فرمایا ہے؟ پس یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ یہ آیت صرف حضرت علی رض کے حق میں ہے۔ نیز آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قتال مرتدین میں وہ جماعت کامیاب ہوگی اور فتنہ ارتداد کا قلع قمع ہو جائیگا لیکن سیدنا حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے دور میں ایسا نہیں ہوا۔

مذکورہ بالا وضاحتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث حوض کا مصداق یہی مرتدین ہیں جنکی خبر قرآن کریم میں آئی اور جن کے خلاف حضرت ابوبکر صدیق رض اور دیگر صحابہ کرام نے جہاد کیا۔ حدیث حوض کا مفہوم یہ ہے کہ حوض کوثر پر کچھ لوگ حاضر ہوں گے لیکن ملائکہ انہیں پیچھے دھکیل دیں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے یہ تو میرے اصحاب ہیں اس پر ملائکہ کہیں گے کہ آپ کو علم نہیں کہ آپ کے بعد ان لوگوں نے کیا کیا۔ ان مرتدین کے بارے میں صحیح بخاری میں کتاب الانبیاء " باب نزول عیسی بن مریم " سے قبل مذکور ہے :- وھم المرتدون الذین ارتدوا علی عھد ابی بکر، قاتلھم ابوبکر رضی اللہ عنہ " یہ مرتدین (جن کا حدیث حوض میں ذکر ہے) وہی لوگ ہیں جو ابوبکر صدیق رض کے دور خلافت میں مرتد ہوگئے تھے جن کے خلاف حضرت ابوبکر رض نے قتال کیا۔ " فتح الباری شرح صحیح بخاری میں امام خطابی رح کا قول نقل کیا گیا ہے " لم یرتد من الصحابۃ احد، وانما ارتد قوم من جفاۃ الاعراب ممن لا نصرۃ لہ فی دین و ذالک لا یوجب قدحا فی الصحابۃ المشھورین، ویدل قولہ " اصیحابی " بالتصغیر علی قلۃ

عددھم۔ " صحابہ کرام (مہاجرین وانصار اور مولفتہ القلوب قریش مکہ) میں سے کوئی بھی مرتد نہیں ہوا۔ البتہ اجڈ قسم کے بدووں کی ایک جماعت ضرور مرتد ہوئی جن کی دین میں کوئی نصرت نہیں تھی اور یہ بات مشہور صحابہ میں موجب قدح نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بصیغہ تصغیر اصیحابی

(میرے چند اصحابی) فرمانا مرتدین کی تعداد کی قلّت واضح کرتا ہے"۔

عام الوفود میں بعض عرب قبائل کے وفود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کرلیا، ان لوگوں نے کسی جہاد میں حصہ نہیں لیا تھا اور نہ ہی انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل صحبت اور تربیت حاصل ہوئی تھی۔ یہ لوگ اپنے قبائل میں واپس گئے تو انھوں نے بھی دیکھا دیکھی اسلام قبول کرلیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد کچھ لوگ جو عام الوفود میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، مرتد ہوئے کچھ لوگوں نے مثلا اسود عنسی اور مسیلمہ کذاب وغیرہ نے تو آپ کی حیات طیبہ میں ارتداد اختیار کیا۔ ان چند مرتدین کے قبائل کے دیگر افراد نے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تک نہیں تھا، اس لئے حدیث حوض کی مستند روایات میں اصیحابی بصیغہ تصغیر ہے۔ اگر خلفائے راشدین اور ان کے ساتھی مرتد ہوئے ہوتے تو آیت ارتداد کے تحت مغلوب و مقھور ہوتے نہ کہ ایسی زبردست امارت وخلافت کے مالک ہوتے جن کے آگے قیصر و کسری کی متکبر گردنیں جھک گئیں۔

بعض اہل علم نے حدیث کوثر میں اصحاب کو لغوی معنی میں لیتے ہوئے عام امتی مراد لئے ہیں۔ کیونکہ اس طرح کی بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ میں عیسی بن مریم کی طرح کہوں گا کہ (اے اللہ) میں جب تک ان کے اندر رہا مجھے ان کے حال کا علم تھا پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان کے کاموں سے باخبر تھا۔ . ظاہر ہے یہاں حضرت عیسی علیہ السلام اپنے زمانے کے حواریوں کی بات نہیں کررہے بلکہ اپنی امت کی بات کررہے ہیں ورنہ حواری الوہیت عیسی اور تثلیث کے کبھی قائل نہ ہوئے تھے، یہ عقائد

تو عیسائیوں میں بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ اصحاب کے لغوی معنی میں ہم زمانہ ہونے کا مفہوم پایا جانا ضروری نہیں مثلا اصحاب ابي حنیفہ کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لازما امام ابو حنیفہ کے ہم عصر بھی ہوں۔ الغرض احادیث حوض اور آیت ارتداد کا اطلاق مہاجرین وانصار اور مولفتہ القلوب صحابہ کرام پر نہیں ہوتا جن کے قطعی جنتی اور مغفور ومرحوم ہونے پر قرآنی محکمات موجود ہیں

(چودھویں قسط).

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(نوٹ) اس قسط کا مضمون گزشتہ سال کی ایک پوسٹ (مع اضافہ) پر مشتمل ہے
کیا امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ اس باغی گروہ میں شامل تھے جس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار بن یاسر (رض) کو فرمایا تھا کہ تجھے باغی گروہ قتل کرے گا؟؟

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے متعلق احادیث میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: تقتلک الفئتہ الباغیہ۔ یعنی تجھے باغی گروہ قتل کرے گا؛ اور بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ عمار انہیں جنت کی طرف بلاتا ہوگا اور وہ اسے آگ کی طرف بلاتے ہوں گے۔ اس سے یہ غلط استدلال کیا گیا کہ چونکہ جنگ صفین میں حضرت عمار (رض) حضرت علی کرم اللہ وجہ کی فوج میں تھے اور مشہور تاریخی روایات کے مطابق وہ اس جنگ میں شہید ہو گئے تھے اس لئے حضرت معاویہ (رض) اور ان کے سب ساتھی الفئتہ الباغیہ (باغی گروہ) میں شامل ہیں بلکہ بعض نے مبالغہ کرتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ جہنم کی طرف دعوت دینے والے گروہ میں شامل ہونے کی وجہ سے حضرت معاویہ اور ان کے ساتھی (معاذاللہ) مرتد اور کافر ہیں۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ اس طرح کی احادیث کا مصداق کسی بھی جانب کے صحابہ کرام نہیں ہیں بلکہ وہ فتنہ جو اور شریر لوگ اس کا مصداق ہیں جو دونوں طرف شامل تھے۔ مثلا تاریخی روایات کے مطابق شمر ذی الجوشن وہ اخبث الخبائث شخص ہے جو سانحئہ کربلا کا سب سے بڑا شیطانی کردار ہے یہی شمر جنگ صفین میں حضرت علی کے لشکر میں شامل تھا یا مثلا عمرو بن جرموز جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں تھا اس نے حضرت زبیر (رض) کو شہید کیا اور آپ کے سر مبارک کو لیکر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بغرض انعام پہنچا

اور ملاقات کا خواستگار ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابن صفیہ (حضرت زبیر) کے قاتل کو جہنم کی بشارت سنادو اور اسے اپنے پاس آنے نہیں دیا۔ تو جسطرح شمر ذی الجوشن اور عمر بن جر موز جیسے خبیث الفطرت لوگوں کی وجہ سے حضرت علی اور آپ کے مخلص ساتھیوں پر ہر گز کوئی حرف نہیں آتا بعینہٖ اسی طرح حضرت معاویہ (رض) کی فوج میں شامل اسی قماش کے لوگوں کی وجہ سے آپ پر اور آپ کے مخلص ساتھیوں پر بھی کوئی حرف نہیں آتا۔ حضرت عمار بن یاسر (رض) کے قتل کے متعلق تاریخی کتب مثلاً البدایہ والنہایہ میں مرقوم ہے کہ آپ کے دو قاتل ابن جوی سکسکی اور ابو الغاویہ فراری حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کے پاس پہنچے، یہ دونوں باہم جھگڑ رہے تھے کہ حضرت عمار سے چھینے گئے لباس اور ہتھیاروں پر ان کا حق ہے۔ تو حضرت حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے انہیں فرمایا کہ تم دونوں آگ کے بارے میں جھگڑ رہے ہو یعنی تم دونوں قتل عمار کی وجہ سے جہنمی ہو۔ حضرت معاویہ (رض) نے فرمایا تھا کہ ہم نے حضرت عمار کو شہید نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے کیا ہے جو انہیں میدان جنگ میں کھینچ لائے ہیں۔آپ کا اشارہ فتنہ جو لوگوں مثلاً قاتلین عثمان اور ان کے کھلے ہمنواوں کی جانب تھا جن کی وجہ سے ان جنگوں تک نوبت آ پہنچی تھی۔آپ کا اشارہ ہر گز حضرت علی اور ان کے مخلص ساتھیوں کی طرف نہیں تھا۔ کسی بھی جماعت میں شامل خبیث لوگوں کی وجہ سے پوری جماعت یا گروہ کو ہر گز مطعون نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت عمرو بن العاص نے بھی حضرت عمار بن یاسر کے قاتل کو جہنم کی بشارت دی تھی۔ صحابہ کرام کا مرحوم و مغفور ہونا قرآن کریم کی قطعی الدلالتہ اور محکم آیات سے ثابت ہے اور جو روایات خلاف قرآن ہیں وہ قابل قبول نہیں ہو سکتیں۔

جہاں تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے مخلص ساتھیوں خصوصاً صحابہ کرام کے (معاذاللہ) مرتد، منافق یا کافر ہونے کا دعوی ہے تو درج ذیل وجوہ کی بنا پر باطل ہے۔

(1) اگر حضرت معاویہ اور آپ کے مخلص ساتھی اس ٹھیک باغی جماعت میں شامل ہوتے جو لوگوں کو جہنم کی دعوت دے رہی تھی اور حضرت عمار بن یاسر کی شہادت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوتا تو یہ

بات جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل جاتی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر گز ہر گز جنگ بند نہ کرتے اور حکمین کے تقرر پر راضی نہ ہوتے خواہ ان پر کتنا ہی دباو کیوں نہ ہوتا۔

(2) بہت سے صحابہ کرام ایسے بھی تھے جنہوں نے ان جنگوں میں حصہ نہیں لیا تھا اور کئی ایک نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ہی نہیں کی تھی تو یہ حضرات باغی گروہ کا صاف صاف پتہ چل جانے پر ہر گز غیر جانبدار نہ رہتے بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کھلم کھلا ساتھ دیتے

(3) حضرت ابو موسی اشعری رض جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے حکم تھے یقینا وہ حضرت عمار رض کی شہادت کے حوالہ سے حضرت معاویہ رض کے حکم حضرت عمرو بن العاص پر الزام عائد کرتے اور ہر گز اس امر پر تیار نہ ہوتے کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کو معزول کر دیا جائے۔

(4) حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت کے آخری دنوں میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ہر گز صلح نہ کرتے۔

(5) قرآن کریم میں سورہ مائدہ کی آیت قتال مرتدین کی رو سے حضرت علی یقینا حضرت معاویہ پر ایسے ہی غالب آتے جیسے آپ حقیقی باغیوں خوارج پر غالب آئے تھے۔ یہ خوارج بے مثال شجاعت کے باوجود شرمناک ہزیمت سے دوچار ہوئے تھے۔ اس آیت میں مرتد ہونیوالوں کو یہ وعید سنائی گئی ہے کہ ان کے مقابلے میں اللہ کے مقرب بندوں کی جماعت ان پر غالب آئیگی۔ یہاں دونوں فریق حق پر تھے۔ حق کا حق سے کوئی مقابلہ نہیں ہوا کرتا کہ ایک فریق کو غالب اور دوسرے کو مغلوب قرار دیا جائے۔

(6) حضرت حسن رضی اللہ تعالی عنہ ہر گز ہر گز حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کرکے امت مسلمہ کی قیادت اور منصب خلافت ان کے سپرد نہ کرتے۔ اس صلح کو ہر گز صلح حدیبیہ سے تشبیہہ نہیں دی جاسکتی۔ حدیبیہ کی صلح میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر گز اسلامی ریاست کی سربراہی قریش مکہ کے سپرد نہیں کر دی تھی۔

(7)اس صورت میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ کے دور خلافت میں جو جنگی مہمات ہوئیں انہیں ہر گز جہاد نہیں کہا جاسکتا۔ صحابہ کرام ان جنگوں میں مثلا جنگ قسطنطینہ میں ہر گز ہر گز شریک نہ ہوتے یاد رہے کہ اس جنگ میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ میزبان رسول بھی شریک ہوئے تھے اور انہی دنوں وہیں ان کا انتقال ہوااور بموجب وصیت وہیں مدفون ہوئے نیز مورخین نے اس جنگ میں حضرت حسین رضی اللہ تعالی عنہ کے شریک ہونیکو بھی تسلیم کیا ہے۔

(8)سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس صورت میں قرآن کریم کی ان تمام آیات کے مضمون کو (معاذاللہ) جھوٹا قرار دینا ہوگا جن میں فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کرنے والے مہاجرین وانصار اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے مولفتہ القلوب کے مغفور ومرحوم ہونیکی ایسی محکم خبریں دی ہیں جن میں کسی طرح کے ابہام، اشتباہ کا گزر تک نہیں یعنی یہ قرآنی نصوص قطعی الدلاتہ ہیں۔

(9)جب اہل شام یعنی حضرت معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو اپنے ایک گشتی مراسلے میں خود حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے مومن قرار دیا ہے تو دوسروں کو حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے خلاف رائے زنی کا حق ہی کب حاصل ہے؟

جنگ صفین کے بعد آپ نے اپنے علاقے کے شہروں میں جو مراسلہ ارسال فرمایا تھا اس کا مضمون " نہج البلاغہ " کے مطابق یوں ہے کہ ہمارا اور اہل شام کا مقابلہ ہوا حالانکہ ظاہر ہے کہ ہمارا خدا ایک ہے نبی ایک ہے اور دعوت فی الاسلام ایک ہے، اللہ تعالی پر ایمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے متعلق نہ ہم ان سے کسی زائد چیز کا مطالبہ کرتے ہیں اور نہ ہی وہ ہم سے کوئی مزید مطالبہ کرتے ہیں سوائے اس کے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کے خون کے معاملے میں ہمارا اختلاف ہے اور ہم اس (خون ناحق) سے بری ہیں۔

(10)سورہ حجرات میں ہے کہ مسلمانوں کی دو جماعتوں میں جنگ ہو جائے تو ان میں صلح کرادیا کرو کیونکہ مومن باہم بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ باہم جنگ کی وجہ سے مسلمان دائرہ

اسلام سے ہی خارج نہیں ہو جاتے۔ نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نواسے سید نا حضرت حسن رضی اللہ تعالی عنہ کے متعلق فرمایا تھا کہ میرا یہ بیٹا سید ہے ممکن ہے اللہ تعالی اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان صلح کرادے۔ اس حدیث کا مضمون قرآنی مدلول کے تقاضوں سے عین ہم آہنگ ہے لہٰذا قبول کیا جائیگا۔

(11) صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ کی روایت کے مطابق خوارج سے جنگ کرنیوالی جماعت اولی الطائفتین بالحق (حق سے زیادہ قریب) ہو گی۔ اس سے بہت سے حضرات نے یہ مسئلہ کشید کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کا موقف اولی اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ کا خلاف اولی تھا۔ یعنی دونوں فریق حق پر تھے۔ لیکن اس پر سب سے بڑا اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ وہ دسیوں ہزار صحابہ کرام رض جو ان مشاجرات سے الگ تھلگ رہے تھے وہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے موقف کو یقیناً اولی سمجھتے تو نہ صرف قولاً بلکہ عملاً بھی ان کا ساتھ دیتے۔ دوسرا اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ جس جماعت کا موقف خلاف اولی ہو یعنی اختلاف صواب اور خطا کا نہ ہو بلکہ صرف اولی اور خلاف اولی کا ہو تو ایسی جماعت یا گروہ کو طائفہ باغیہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اس لئے حدیث کا صاف اور بے غبار مطلب یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ جہاں اور بہت سی باتوں میں سید نا حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ پر سبقت حاصل ہے تو خوارج کے فتنے کو سمجھنے اور حضرت عبداللہ بن عباس کے ذریعے دلائل کی بناء پر ان پر حجت پوری کرنے اور پھر جنگ وجدال اور فتنہ و فساد سے باز نہ آنے پر ان کے خلاف مسلح جہاد کرنے اور ان کی جمعیت اور قوت کو منتشر کرنے میں اور فتنے کو بڑی حد تک کچل دینے میں سید نا حضرت علی رض حضرت معاویہ رض پر سبقت لے گئے۔ خوارج دینی گمراہی میں مبتلا تھے اور کھلے عام امت مسلمہ سے کٹ کر الگ ہونے والے پہلے لوگ تھے جن کے خلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بالآخر لشکر کشی فرمائی

(پندرھویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیث زیر نظر کے کلمات اولی الطائفتین بالحق (دونوں جماعتوں میں سے حق کے زیادہ قریب) کا دوسرا متفق علیہ مطلب یہ ہے کہ نفس خلافت کے اعتبار سے حضرت علی رضی اللہ عنہ احق بالخلافہ ہیں چنانچہ بشمول حضرت علی رضی اللہ عنہ خلفائے اربعہ کی خلافت ہی اہل حق کے اجماعی عقیدے کے مطابق خلافت راشدہ خاصہ اور اس کے مقابلے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور بعد والے نیک خلفاء کی خلافت، خلافت راشدہ عامہ یا خلافت عادلہ ہے۔ خلافت کے صحیح ہونیکو تسلیم نہ کرنے اور بیعت خلافت نہ کرنے میں فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے برحق ہونیکا ایک لمحے کے لئے بھی انکار ہوتا تو وہ شروع ہی سے اپنی الگ خلافت کا یقینا دعوی اور اعلان کرتے۔ حالانکہ سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے صلح سے پہلے انہوں نے کبھی بھی اپنی خلافت کا دعوی نہیں کیا۔ چنانچہ حضرت معاویہ رض کی امارت وحکومت صلح سے پہلے متفق علیہ نہیں تھی لیکن اس کے برعکس حضرت علی کی خلافت راشدہ تو ہمیشہ سے متفق علیہ رہی ہے۔ اس سے سوائے خوارج کے کسی ایک متنفس نے بھی انکار نہیں کیا۔ البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون ناحق کے قصاص کے معاملے میں اختلاف کی وجہ سے حضرت علی رض کی بیعت پر سب کا اتفاق نہ ہو سکا۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگی بشارت کی بناپر آپ کے محبوب نواسے سیدنا حضرت حسن رض کی مصالحت اور بھرپور تعاون سے حضرت معاویہ رض کی خلافت کی بیعت پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ جہاں تک دم عثمان رض کے متعلق حضرت علی رض اور حضرت معاویہ رض میں اختلاف رائے کا تعلق ہے تو حضرت علی رض کو احق بالخلافہ سمجھنے اور انہیں مقام ومرتبہ کے لحاظ سے کہیں زیادہ افضل وبرتر ماننے کے باوجود

صحابہ کرام رض کی عظیم اکثریت یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کس کا موقف اولی اور کس کا خلاف اولی ہے۔ بلکہ وہ دونوں حضرات کو اپنے اپنے مقام پر حق بجانب سمجھتے ہوئے ان کی جنگوں میں شریک نہ ہوئے بلکہ الگ تھلگ رہے۔ یعنی انہوں نے سکوت اور توقف کو اختیار کیا۔ غور کیجئیے اللہ تعالی کی حکمت بالغہ کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ ان جنگوں سے الگ تھلگ رہیں کیونکہ وہ قرآن کریم کی نصوص صریحہ کے مطابق باہم بھائی بھائی اور آپس میں ایک دوسرے پر مہربان تھے۔ اللہ تعالی نے سورہ آل عمران میں صحابہ کرام پر اپنا احسان جتاتے ہوئے فرمایا ہے کہ " تم اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو جبکہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی تو تم اس کی نعمت سے باہم بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچالیا" (آل عمران 103)

اس آیت کریمہ کے مخاطب صحابہ کرام کو اللہ تعالی نے جہنم کی آگ سے بچ جانیکی بشارت بھی سنادی۔ اس لئے بعد میں باہم تفرقہ بازی پر جو وعید سنائی گئی ہے وہ بعد کے لوگوں کے لئے ہے۔ آیت کے مخاطب اصحاب رسول سے اس کا تعلق نہیں۔ فتح مکہ کے ایام میں اللہ تعالی نے اہل ایمان کو یہ بشارت سنادی کہ " بہت ممکن ہے کہ اللہ تمہارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تمہاری دشمنی ہے محبت پیدا کر دے اور اللہ قادر ہے اور بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے" (الممتحنہ 27)۔
اگر کوئی شخص دوسرے پر ایسا احسان جتائے جسے وہ بعد میں واپس لینے کا پہلے ہی سے ارادہ رکھتا ہو تو ہرگز اسے شریف انسان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اللہ تعالی تو عالم الغیب والشادہ ہے، کسی فرد یا جماعت کو متعین کرکے وہ ایسا احسان جتائے گا ہی کیوں جسے بعد میں اس نے واپس لے لینا ہو۔ پس جس کا بھی قرآن کریم پر سچا ایمان ہے اس کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالی نے صحابہ کرام کو باہم الفت و محبت اور مواخات کی جو نعمت عطا فرمائی تھی اور اس کا اس نے احسان جتایا تھا وہ نہ تو اس نے ہرگز ہرگز واپس لینی

تھی اور نہ ہی واپس لی ، ورنہ احسان جتانا ہی بیکار ہوتا اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کی عظیم اکثریت فتنوں کے زمانے میں باہم لڑائی سے الگ تھلگ رہی۔ اور جس نہایت ہی قلیل تعداد نے حصہ بھی لیا تو ان کی باہم محبت کا حال بھی سن لیجئیے۔ فتنے کے ان ایام میں قیصر روم نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں اور حضرت معاویہ رض کو ہمدردی کا پیغام بھیجتے ہوئے بھرپور تعاون کی پیشکش کی۔ اس پر حضرت معاویہ رض نے سخت مشتعل ہو کر قیصر روم کو لکھا " اللہ کی قسم اگر تو اس اقدام سے باز نہ آیا اور اپنے علاقوں کی طرف واپس نہ لوٹا تو اے ملعون تو میں اور میرے چچا کے بیٹے (حضرت علی رض) تیرے خلاف باہم صلح کر لیں گے اور میں تجھے تیری آبادیوں سے نکال دوں گا اور زمین کے فراخ ہونیکے باوجود اسے تجھ پر تنگ کر دوں گا " اس پر وہ خوف زدہ ہو گیا اور اپنے اقدام سے رک گیا اور قاصد بھیج کر صلح کا خواستگار ہوا۔

(البدایہ والنہایہ 8/119 تحت ترجمہ معاویہ)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ صفین کے مقتولین سے متعق فرمایا قتلانا وقتلاھم فی الجنتہ۔ یعنی ہمارے اور ان کے مقتول جنت میں جائیں گے۔ (مجمع الزواید للہیثمی 9/357 سیر اعلام النبلاء للذہبی 3/95 تحت تذکرہ معاویہ بن ابی سفیان)۔

نعیم بن ابی ہند نے اپنے چچا سے حضرت علی رض کا قول نقل کیا ہے کہ ہمارے اور فریق مخالف کے مقتولین میں سے جو بھی اللہ کی رضا اور آخرت کا طالب تھا وہ جنت میں داخل ہو گا۔ (السنن سعید بن منصور 3/374 روایت رقم 2968 طبع مجلس علمی کراچی)۔ ان روایات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت علی رض ہر گز حضرت معاویہ رض کو اس باغی ٹولے میں شمار نہیں کرتے تھے جو لوگوں کو جہنم کی آگ کی طرف دعوت دے رہا تھا۔ یہ تو سبائیوں اور خوارج کا ٹولہ تھا۔ ابوامامہ الباہلی سے روایت ہے کہ میں صفینق میں موجود تھا تو وہ لوگ کسی زخمی کو مزید زخمی نہیں کرتے تھے اور پیٹھ پھیر جانے والے

کا پیچھا نہیں کرتے تھے۔اور کسی بھی مقتول کا لباس اور ہتھیار سلب نہیں کرتے تھے۔(المصنف لابن ابی شیبہ 12/424 طبقات ابن سعد 7/132) ۔

جب حضرت معاویہ رض کو حضرت علی رض کی شہادت کی خبر ملی تو آپ آبدیدہ ہوگئے۔آپ کی اہلیہ نے کہا کہ آپ تو حضرت علی رض کے خلاف لڑتے رہے ہیں اب آپ کیوں روتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا تجھ پر افسوس تجھے کیا پتہ کہ لوگ علم اور فقہ سے کس قدر محروم ہوگئے ہیں۔(البدایہ والنہایہ 8/130)۔

ضرار الصدائی حضرت علی رض کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ شہادت علی رض کے بعد ایک مرتبہ حضرت معاویہ رض کے پاس آئے۔ حضرت معاویہ رض کے بار بار شدید اصرار پر ضرار نے حضرت علی رض کے اوصاف بیان کرنا شروع کیے تو حضرت معاویہ رض سن کر رونے لگے اور اتنا روئے کہ ان کی داڑھی تربتر ہوگئی۔(درہ نجفیہ شرح نہج البلاغہ صفحہ 360 طبع قدیم ایران، شرح نہج البلاغہ حدیدی معتزلی شیعی طبع بیروت 4/374 شرح نہج البلاغہ ابن میثم البحرانی الشیعی 5/476 طبع تہران الاستیعاب لابن عبدالبر 3/43 تحت علی بن ابی طالب رض)۔

اس طرح کی روایات کا انبار لگایا جاسکتا ہے جو کہ قرآنی مدلول کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں لہٰذا قابل قبول ہیں۔ان کی اسناد کی چھان بین کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر یہ روایات بالفرض نہ بھی ہوتیں تو بھی متعلقہ مذکورہ قرآنی مضامین کو کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے؟ اگر کتاب اللہ کے مدلول کے تقاضوں کے خلاف لاکھوں روایات بھی ہوں تو وہ دریابرد کئے جانے کے لائق ہیں

(سولھویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عربی زبان کے بعض کلمات اردو میں بھی مستعمل ہیں لیکن معنی میں فرق ہو سکتا ہے۔ مثلا جاہل کا لفظ اردو میں اپنے اندر اہانت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ کسی جاہل کو بھی جاہل کہنا اشتعال انگیز ہے جبکہ قرآن کریم میں عام ناواقف اور بے خبر کو بھی جاہل کہا گیا ہے اور اس میں اہانت نہیں پائی جاتی۔ یحسبھم الجاہل اغنیآء من التعفف (البقرہ 273)۔" یعنی ناواقف شخص (زکوہ اور صدقات کے مستحق) ان "لوگوں کو غنی سمجھ لیتا ہے کہ کسی سے کچھ مانگتے نہیں

اور مثلا ضلال کو اردو میں گمراہی کے مذموم معنی میں لیا جاتا ہے لیکن عربی میں سادہ لاعلمی اور بے خبری کو بھی ضلال کہہ دیا جاتا ہے۔ برادران یوسف علیہ السلام نے اپنے والد ماجد کے متعلق کہا تھا ۔ "۔؛۔ان ابانا لفی ضلال مبین (یوسف 8) ۔ " کہ ہمارے ابا جان کو ان باتوں کا بالکل پتہ ہی نہیں یہی حال لفظ بغاوت کا ہے۔ سورہ الحجرات میں :۔ فان بغت احداھما علی الاخری (اگر ایک جماعت دوسری پر زیادتی کرے) کے کلمات میں سرے سے حدت و شدت ہے ہی نہیں۔ اسی لئے سیاق کلام میں مسلمانوں کی باہم اخوت کا بھی ذکر ہے، لیکن اردو میں باغی کے لفظ سے سخت ناگوار تاثر ابھرتا ہے۔ یہی حال لفظ خروج کا بھی ہے۔ اردو میں ماضی بعید میں یہ لفظ چنداں معیوب نہ تھا لیکن دور حاضر میں اس سے بھی ناخوشگوار تاثر پیدا ہوتا ہے۔ جیسے علامہ شبلی نے سیرت النبی میں کئی مقامات پر مال غنیمت کو لوٹ کا مال لکھا ہے۔ لیکن دور حاضر میں لوٹ کا مال تو وہ ہوتا ہے جسے ڈاکوؤں نے لوگوں سے چھینا ہو۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معانی یا ان کے تاثرات میں فرق پڑتا رہتا ہے۔ خلیفہ کے انتخاب کے طریق کار میں مثبت اور مستقل اصلاح کے لئے سیدنا حضرت حسین رضی اللہ تعالی عنہ اور سیدنا

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مہمات اور اصلاحی تحریکوں پر دور حاضر میں اردو زبان میں خروج کا عنوان بھی ہمیں تو خلاف ادب دکھائی دیتا ہے۔ پس وہ بغاوت تو یقینا مذموم و مردود ہے جو کفر و نفاق، بغض و عناد، افتراق و انتشار، عداوت و فرقہ واریت اور ضلال و بدعت پر مبنی ہو۔ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ اور خوارج اسی طرح کے باغی ہیں۔ اردو زبان میں بغاوت کا عموماً یہی مذموم معنی لیا جاتا ہے۔ لیکن عربی زبان میں بعض اوقات بغاوت کا مفہوم مذموم و مردود تو کجا بلکہ محمود نہ سہی تو پھر بھی غیر مذموم اور اس کا مرتکب عنداللہ ماجور ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسی بغاوت اصلاح احوال کی خاطر خلوص نیت پر مبنی ہوتی ہے اور اس کا مرتکب محض خطائے اجتہادی کا شکار ہوتا ہے اور خطائے اجتہادی پر بھی عنداللہ وہ اکہرے اجر کا مستحق ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی معنی میں سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف بغاوت کی نسبت کی تو وہ انہیں خطائے اجتہادی پر سمجھتے تھے ورنہ وہ ہرگزیہ نہ فرماتے کہ ہمارے اور ان کے مقتولین دونوں جنت میں ہوں گے اور یہ بھی نہ فرماتے کہ ہم میں سے اور ان میں سے جس نے بھی اللہ کی رضا کی خاطر باہم قتال کیا ہے وہ سب جنتی ہیں۔ ایسی تاریخی روایات جو کتاب اللہ کے مدلول کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں انہیں بلا جھجک بشرح صدر قبول کرنا ہوگا اور جو ہم آہنگ نہ ہوں وہ مردود و متروک ہوں گی۔ مثلاً ابو مخنف لوط بن یحیٰ، ابو جناب کلبی، ہشام بن محمد بن السائب وغیرہ وغیرہ کذاب، مفتری اور جلے بھنے رافضی راویوں کی ایسی روایات ملعون و مردود ہوں گی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر لفظ بغاوت کی حضرت معاویہ رض کی طرف نسبت کرتے تھے تو انہیں اپنا بھائی بھی قرار دیتے تھے۔ مثلاً شیعہ عالم عبداللہ بن الحمیری لکھتے ہیں کہ حضرت جعفر صادق رح نے حضرت محمد باقر رح سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی رض اپنے محاربین کی طرف شرک و نفاق کو منسوب نہیں کرتے تھے بلکہ فرماتے تھے:- ھم اخواننا بغوا علینا" کہ وہ ہمارے بھائی ہیں جنہوں نے ہم پر زیادتی کی ہے۔ (قرب الاسناد، صفحہ 45 طبع قدیم) اور اسی کتاب میں حضرت

علی رض کا قول ہے کہ ہم نے اپنے مخالفین سے تکفیر کی بناپر قتال نہیں کیااور نہ ہی ہمارے مخالفین نے ہمیں کافر قرار دے کر ہم سے قتال کیا ہے، ولکنارا ءینا انا علی حق وراء وا انھم علی حق (ایضا صفحہ 45) "
لیکن ہم نے سمجھا ہے کہ ہم (ان سے اپنی بیعت کے مطالبے میں) حق پر ہیں اور انہوں نے سمجھا ہے کہ وہ ہم سے (قاتلین عثمان رض سے پہلے قصاص لینے کے اپنے مطالبے میں) حق پر ہیں۔ الغرض حضرت علی رض نے حضرت معاویہ رض اور ان کے ساتھیوں کو کسی مذموم معنی میں نہیں بلکہ انہیں خطائے اجتہادی پر قرار دیتے ہوئے باغی کہا ہے۔ چونکہ خطائے اجتہادی پر بھی مجتہد کو اکہراا جر ملتا ہے، اسی لئے تو حضرت علی رض نے فرمایا کہ ہمارے اور ان کے مقتولین دونوں جنتی ہیں۔ حضرت علی رض ہی کی اتباع میں ہمارے جن اکابر نے حضرت معاویہ رض کو باغی یا مخطی قرار دیا ہے تو الاماشاء اللہ ان میں سے کسی کا بھی مقصود حضرت معاویہ رض کی توہین و تنقیص نہیں بلکہ ٹھیک ٹھیک اسی معنی غیر مذموم کو انہوں نے اختیار کیا ہے جو حضرت علی رض کا لفظ بغاوت سے مفہوم تھا۔ اس کے باوجود ہمارے بعض اکابر کا یہ اقدام اس لئے تسامح ہے کہ حضرت علی رض کا مقام و مرتبہ حضرت معاویہ رض سے بہت بلند ہے اور وصف صحابیت بھی حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) دونوں میں مشترک ہے۔ دونوں حضرات بموجب نصوص قرآنی حسن عاقبت کے اعتبار سے معلوم العاقبہ ہیں اور بعد والے اپنی عاقبت کے علم کے اعتبار سے مجہول العاقبہ ہیں۔ اس لئے حضرت علی رض کو تو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی اور اپنے سے کم تر مرتبے کے صحابی رسول کو غیر مذموم معنی میں باغی اور مخطی قرار دیں لیکن بعد والوں کو یہ حق حاصل نہیں۔ کیونکہ اردو زبان میں تو باغی کا لفظ اکثر و بیشتر مذموم معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے ۔ یہاں اولی صورت یہی ہے کہ ان مشاجرات میں صحابہ کرام کی عظیم اکثریت، حضرت عمر بن عبدالعزیز رح، امام ابو حنیفہ، امام احمد بن حنبل، امام حسن بصری اور شیخ عبدالقادر جیلانی وغیرہ وغیرہ متقدمین اکابر کے موقف کے مطابق توقف اور سکوت سے کام لیا جائے۔ تاہم جن حضرات نے حضرت

علی رض کی اتباع کی ہے وہ بھی عنداللہ ماجور ہیں۔ کیونکہ ان حضرات کا بھی عقیدہ ہے کہ بعد میں حضرت علی رض اور پھر حضرت حسن رض سے مصالحت کے بعد حضرت معاویہ رض کو باغی سمجھنا درست نہیں اور ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ بعد والوں میں کوئی بڑے سا بڑا ولی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی بھی صحابی کے مقام و مرتبہ کو ہرگز (پھر دہرائیے) ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ پس ان اکابر حضرات کے احترام میں بھی ہم کوئی کمی نہیں کرتے، گو مشاجرات صحابہ کے متعلق ان کے موقف کو ہم خلاف اولی اور مرجوح سمجھتے ہیں

(ستارھویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہی حال لفظ "سب" (بتشدید با) کا ہے کہ اردو میں یہ لفظ ہمیشہ گالی گلوچ کے مذموم معنی میں لیا جاتا ہے لیکن عربی میں ہر جگہ اس سے مذموم معنی مراد نہیں ہوتا بلکہ فریق مخالف کی رائے کی سختی سے مخالفت کرنے اور اپنی رائے کے درست ہونے پر زور و شور سے استدلال کرنے پر بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں ہم ابومخنف لوط بن یحیٰ جیسے راوی ہی کی ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ :- مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوفہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عامل کی حیثیت سے سات سال اور کچھ مہینے رہے۔ وہ بہترین سیرت کے مالک تھے اور عافیت کو تمام لوگوں سے زیادہ پسند کرتے تھے البتہ وہ حضرت علی رض کی مذمت اور انہیں برا بھلا کہنا نہیں چھوڑتے تھے، روایت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں۔ " حضرت مغیرہ رض کھڑے ہوئے اور حضرت علی اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہما) کے بارے میں وہی کچھ کہا جو وہ کہا کرتے تھے، ان کے الفاظ یہ تھے - اے اللہ ! عثمان بن عفان رض پر رحم فرما اور ان سے در گزر فرما اور ان کے بہتر عمل کی انہیں جزا دے کیونکہ انہوں نے تیری کتاب پر عمل کیا اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی اور ہماری بات ایک کر دی اور ہمارے خونوں کو بچایا اور مظلوم ہو کر قتل ہو گئے۔ یا اللہ ! ان کے مددگاروں، دوستوں، محبت کرنے والوں اور ان کے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں پر رحم فرما اور ان کے قاتلوں کے لئیے بددعا کرتے تھے (تاریخ طبری 4/188)۔
اس روایت سے نام نہاد سب و شتم کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔
ایک شخص حضرت سہل بن سعد کے پاس آیا اور بولا کہ امیر مدینہ منبر پر کھڑے ہو کر ہم پر (اصحاب علی رض) سب و شتم کرتا ہے۔ حضرت سہل نے پوچھا وہ کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ حضرت علی رض کو

ابوتراب کہتا ہے۔ حضرت سہل ہنس پڑے اور فرمایا کہ خدا کی قسم اس نام سے تو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پکارا ہے اور آپ کے نزدیک ان کا اس سے پیارا نام کوئی نہ تھا۔ (صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب علی رض 1/525)۔

اسی سے سمجھ لیجئیے کہ لفظ " سب " کی آڑ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ناحق مورد طعن بنایا جاتا ہے۔ بلکہ اگر سب وشتم کی واقعی ناخوشگوار روایات موجود ہوں تو وہ بھی قطعاً جھوٹی ہیں۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ موجودہ گئے گزرے دور میں بھی اگر کسی شخص کے باپ کو کوئی گالی گلوچ کرتا ہو اور اس کی توہین کے مسلسل درپے ہو تو وہ ہرگز ایسے شخص کی ضیافت اور میزبانی کو اور اس کی طرف سے کسی بھی طرح کے تحائف و ہدایا اور انعامات و عطایا کو قبول نہیں کرے گا۔ حالانکہ حضرات حسنین (رضی اللہ عنہما) اور ان کے اقارب واحباب وغیرہ کا حال تو یہ تھا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ امیر معاویہ رض کے پاس تشریف لے گئے تو حضرت معاویہ رض نے آپ سے کہا کہ میں آپ کو اتنا بڑا عطیہ دوں گا کہ اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں دیا ہوگا تو آپ کو چالیس لاکھ دینار دیئے۔ ایک مرتبہ حضرات حسنین رض دونوں حضرت معاویہ رض کے پاس گئے تو انہیں فوراً دولاکھ درہم دئے اور کہا اس سے پہلے اس طرح عطیہ کسی نے نہیں دیا ہوگا، تو حضرت حسین رض نے جواب دیا کہ ہم سے افضل کسی شخص کو بھی آپ نے نہیں دیا ہوگا۔ ایک مرتبہ حضرت حسن رض اور حضرت عبداللہ بن جعفر رض نے امیر معاویہ رض کے پاس کسی کو مالی مدد کے لئے بھیجا تو آپ نے دونوں یا دونوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک لاکھ درہم بھجوائے۔ یہ واقعہ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حیات طیبہ میں پیش آیا تھا۔ اس پر حضرت علی رض نے اپنے ان اعزہ پر قدرے ناراضگی کا اظہار فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ نے تو ہمیں دیا نہیں تھا بلکہ معاویہ رض نے ہم پر سخاوت کی ہے۔ (البدایہ والنہایہ 8/130)۔

ایک مرتبہ حضرت حسن اور حضرت عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہما) حضرت معاویہ رض کے پاس گئے تو

حضرت معاویہ رض نے حضرت حسن رض سے کہا اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بیٹے خوش آمدید اور تین لاکھ درہم آپ کو دیئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رض سے کہا اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پھوپھی کے بیٹے خوش آمدید اور ایک لاکھ درہم آپ کو دیئے۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رض نے حضرت حسن رض کو ایک لاکھ درہم بھیجے، جو آپ نے اسی وقت اپنی مجلس کے دس مردوں میں تقسیم فرمادیے، ہر ایک کو دس ہزار درہم ملے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رض کو ایک لاکھ درہم بھیجے جو ان سے ان کی اہلیہ فاطمہ نے لے لئے۔ حضرت معاویہ رض حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رض کو ہر سال دس لاکھ درہم بھیجا کرتے تھے۔ اس سالانہ عطیے کے علاوہ ویسے بھی بڑی بڑی رقوم انہیں دیتے رہتے تھے۔ حضرات حسنین رض اور ان کے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن جعفر رض کے علاوہ حضرت معاویہ رض حضرت عائشہ صدیقہ رض، حضرت عبداللہ بن زبیر رض، حضرت عبداللہ بن عباس رض وغیرہ وغیرہ کو بھی گرانقدر نقد عطیات دیتے رہتے تھے۔ جن کی کچھ تفصیل حافظ ابن کثیر رح نے بیان کی ہے۔ (ایضا 8/131)۔

حضرات حسنین رضی اللہ تعالی عنہما کے لئے گرانقدر عطیات و تحائف کا ذکر شیعہ مورخ اور نہج البلاغہ کے شارح ابن حدید معتزلی شیعی نے بھی کیا ہے کہ امیر معاویہ رض پہلے شخص تھے جنہوں نے دس دس لاکھ درہم تک دیئے اور اس طرح کے عطیات حضرت عبداللہ بن عباس رض اور حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رض کو بھی دیئے جاتے تھے۔ (شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید 2/823)۔

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اگر حضرت معاویہ رض اپنے ماتحت حاکموں کے ذریعہ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر مبینہ انداز میں سب و شتم کرانے والے ہوتے تو یہ حضرات ہرگز ہرگز ان عطیات کو قبول نہ کرتے اور نہ ہی حضرات حسنین رضی اللہ عنہما امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس کبھی جایا کرتے۔

اگر ہم علی سبیل التنزل (اپنے موقف سے نیچے اترتے ہوئے) روافض کے اس موقف کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم بھی کرلیں کہ حضرت عمار بن یاسر رض کے بارے میں متعلقہ حدیث کے کلمات الفئۃ الباغیہ سے مراد حضرت معاویہ رض اور ان کے سبھی ساتھی ہیں اور یہ بھی مان لیں کہ بعض روایات کے یہ کلمات کہ حضرت عمار رض انہیں جنت کی طرف اور یہ لوگ انہیں جہنم کی طرف بلا رہے ہوں گے صحیح ہیں تو بھی روافض کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ خوب غور کیجئیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب اپنا خواب اپنے والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام پر پیش کیا تو سیاق کلام میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اللہ تجھ پر اور آل یعقوب پر ایسے ہی اپنی نعمت کو پورا کرے گا جیسا کہ وہ پہلے اسے تیرے آباء ابراہیم اور اسحٰق (علیہما السلام) پر پورا کر چکا ہے۔ یہاں آل یعقوب میں یقینا (پھر دہرایئے یقینا) برادران یوسف علیہ السلام بھی داخل ہیں۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالی نے برادران یوسف کے حسن عاقبت کی خبر حضرت یعقوب علیہ السلام کو پہلے ہی دے رکھی تھی۔ اب بتایئے جب بعد میں برادران یوسف نے اپنے باپ کو دھوکہ دیا، حضرت یوسف علیہ السلام کے باہم قتل کا مشورہ کیا پھر انہیں ویراں کنویں میں پھینک آئے اور گھر آکر باپ سے جھوٹ بولا، اپنے باپ کو سالہا سال کے لئے اتنا پریشان کئے رکھا کہ شدت غم سے ان کی بینائی تک متاثر ہوئی۔ یوں انہوں نے حق اخوت، حق ابوت اور پھر حق نبوت سب حقوق کو سالہا سال تک بری طرح پامال کئیے رکھا تو کیا وہ اپنے ان کارناموں سے باہم ایکدوسرے کو جنت کی طرف بلا رہے تھے یا جہنم کی دعوت دے رہے تھے؟ اگر جنت کی طرف بلا رہے تھے تو اس کی وضاحت مطلوب ہے۔ اگر جہنم کی طرف بلا رہے تھے تو کیا ان کے حسن عاقبت کی جو پیشگی خبر عالم الغیب والشہادہ اللہ تعالی نے حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے ذریعہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دے رکھی تھی وہ آڑے نہیں آئی اور کیا اس بشارت نے بالآخر انہیں پھر سے جنت کے راستے پر نہیں ڈال دیا؟ پس بعینہ اسی طرح جب سیدنا حضرت علی اور پھر سیدنا حضرت حسن (رضی اللہ عنہما)

سے حضرت معاویہ رض کی صلح ہو گئی اور سیدنا حضرت حسن رض کے ذریعہ باہم مصالحت کی بشارت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دے رکھی تھی تو حضرت معاویہ رض اپنے مخلص ساتھیوں سمیت پھر سے اس قرآنی آیت کا مصداق ہو گئے کہ جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد و قتال کیا اور جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا اور اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کیا، ان کا درجہ گو باہم برابر نہیں بلکہ فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کرنے والوں کا مقام و مرتبہ بلند ہے، تاہم اللہ نے ہر ایک سے حسنی (بھلائی) کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اور حضرت معاویہ رض اور ان کے مخلص ساتھی پھر سے اس قرآنی آیت کا مصداق بھی ہو گئے کہ جن کے لئے ہماری طرف سے حسنی

(بھلائی) کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا وہ اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ وہ تو اس کی آواز تک بھی سننے نہیں پائیں گے اور وہ اپنی من پسند آسائشوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بتایئے روافض کو کیا ملا؟؟

ان فی ذالک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید۔

یہاں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ کئی ایک محققین کے نزدیک متعلقہ حدیث کے یہ کلمات کہ عمار رض تو ان لوگوں کو جنت کی طرف اور وہ اسے آگ کی طرف بلا رہے ہوں گے ہر گز حدیث نبوی کا حصہ نہیں ہیں بلکہ مدرج یعنی بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔ اس کے لئے فتح الباری شرح بخاری جیسی کتب کے متعلقہ مضامین دیکھے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ الفاظ واقعی حدیث کا حصہ ہیں تو بھی صحابہ کرام رض کی یہ کرامت ہے کہ روافض کے ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آتا جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا۔

(اٹھارہویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم نے علی سبیل التنزل روافض وغیرہ کے غلط موقف کو بغرض بحث تھوڑی دیر کے لئے جو صحیح تسلیم کیا تھاتو اس کا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ صحابہ کرام کی یہ کرامت ہے کہ روافض وغیرہ کے غلط موقف کو درست ماننے کی صورت میں بھی ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا اور صحابہ کرام کے یقینی حسن عاقبت کی محکم قرآنی خبریں مخالف روایات وغیرہ سے ہر گز متاثر نہیں ہوتیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بحث و مباحثہ کے اصول تسلیم کے تحت تھوڑی دیر کے لئے ستارے، چاند اور سورج کو رب تسلیم کیا اور یوں مشرکین پر ان کی غلطی واضح کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ حقیقی رب تو وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا یعنی پوری کائینات کا خالق و مالک ہے۔ یہاں بھی اصل حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام رض اگرچہ معصوم عن الخطاء نہیں لیکن قرآن کریم سے ثابت ہے کہ وہ کبائر پر ہر گز اصرار کرنے والے نہیں تھے۔ سورہ حجرات میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے ایمان کو محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا ہے۔ وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان اولئک ھم الراشدون۔ فضلا من اللہ و نعمۃ واللہ علیم حکیم (الحجرات 7-8)۔ "اور اس نے کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمہارے لئے ناپسندیدہ بنا دیا۔ یہی لوگ ہیں جو راشد (ہدایت والے) ہیں اور یہ اللہ کی طرف سے فضل اور نعمت کی وجہ سے ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے"۔

پس جن لوگوں نے حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کے اختلاف کو (معاذاللہ ثم معاذاللہ) حق و باطل کا اختلاف قرار دیا انہوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ اللہ انہیں معاف فرمائے۔ کیونکہ حضرت علی رض اور حضرت معاویہ رض کا اختلاف چند دنوں یا مہینوں پر نہیں بلکہ سالوں پر

محیط ہے۔ اتنے عرصہ تک باطل پر (مبینہ) اصرار کبیرہ گناہ پر اصرار کے مترادف ہے، جس کی بھرپور نفی قرآن کریم سے ہورہی ہے۔ ہم قبل ازیں بیان کرچکے ہیں کہ عربی زبان کے بعض کلمات اردو میں مختلف معنوی تاثر لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ حضرت علی رض ہرگز ہرگز حضرت معاویہ رض اور ان کے مخلص ساتھیوں کو کسی مذموم معنی میں نہیں بلکہ غیر مذموم معنی میں باغی قرار دیتے تھے، یعنی وہ انہیں خطائے اجتہادی پر سمجھتے تھے اور چونکہ خطائے اجتہادی پر بھی مجتہد کو اکہرا اجر ملتا ہے اس لئے وہ ان کو جنتی بھی قرار دیتے تھے۔ ہر باطل یقینا خطا بھی ہے لیکن ہر خطا کو ہرگز باطل نہیں کہا جاسکتا۔ اللہ تعالی باطل پر قائم کسی شخص یا جماعت کو اکہرا تو کجا بلکہ اگر وہ چاہے تو ان کا مواخذہ کرسکتا ہے۔ چونکہ بغاوت اور باغی کے الفاظ دور حاضر کی اردو زبان میں عموما ناخوشگوار معنی میں لئے جاتے ہیں لہٰذا حضرت معاویہ رض کے لئے دور حاضر کی اردو میں باغی باغی کی رٹ لگائے جانا اور ساتھ ہی ان کی صحابیت کی تعریف بھی کیے جانا ایک متضاد طرز عمل ہے جو نفسیات کی زبان میں دوہری شخصیت (double personality) کے حامل کسی شخص کا ہی کام ہوسکتا ہے۔

سورہ آل عمران میں ہے :- ولقد نصر کم اللہ ببدر وانتم اذلہ (آل عمران 123)۔

" اور بے شک اللہ نے (غزوہ) بدر میں تمہاری مدد فرمائی جبکہ تم نہایت کمزور تھے" دیکھئے یہاں غزوہ بدر میں شریک صحابہ کرام کو اللہ تعالی نے "اذلہ" فرمایا ہے جو ذلیل کی جمع ہے۔ اب اگر کوئی شخص اردو میں اس کا ترجمہ یوں کرے "جبکہ تم ذلیل تھے" اور صحابہ کرام رض کے لئے دور حاضر کی اردو میں لفظ ذلیل کی بار بار رٹ لگاتا جائے اور ساتھ ہی ان کی صحابیت کی تعریف بھی کرتا جائے تو اس کی عقل و خرد پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ بعینہ اسی طرح دور حاضر میں عربی لفظ "بغی" کا اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے فہم و دانش کو خیر باد نہیں کہنا چاہئیے ورنہ کل کلاں کوئی احمق یا ملحد "ووجدک ضالا فہدی" میں

"ضالا" کا اردو میں ایسا ترجمہ کرسکتا ہے کہ جس سے توہین رسالت لازم آئے۔ آیئے اب ہم یہ بھی دیکھیں کہ حضرت علی رض جو حضرت معاویہ رض کو خطائے اجتہادی پر سمجھتے تھے اور اسی مفہوم کے تحت وہ غیر مذموم معنی میں (آجکل کی اردو میں نہیں بلکہ) اپنے زمانہ کی عربی میں باغی کہتے تھے تو یہاں وہ خطائے اجتہادی سے کیا مراد لیتے تھے؟ اگر اس کی وضاحت خود حضرت علی رض کی زبان مبارک سے ہو جائے تو من و شما کے لئے کج بحثی کی گنجائش ہی کب باقی رہتی ہے؟ بعض اوقات اجتہادی اختلاف صواب و خطا کا نہیں بلکہ اولی اور خلاف اولی کا ہوتا ہے اور اگر اختلاف ایسے اہم معاملے میں ہو جس سے امت کا اجتماعی مفاد یا ضرر وابستہ ہو تو خلاف اولی موقف اختیار کرنے والے فریق کو خطائے اجتہادی کا مرتکب کہا جاسکتا ہے، حالانکہ اس کا موقف فی نفسہ (بذات خود) غلط نہیں ہوتا بلکہ فریقین اپنے اپنے دلائل کی رو سے حق بجانب ہوتے ہیں۔ پس خوب سمجھ لیجیئے کہ سیدنا حضرت علی اور سیدنا حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) اپنے باہمی اختلاف کو ہرگز ہرگز صواب و خطا کا نہیں بلکہ اولی و خلاف اولی کا اختلاف سمجھتے تھے۔ جس کا نمایاں ترین ثبوت یہ ہے کہ صفین سے واپسی پر سیدنا حضرت علی رض نے فرمایا کہ اے لوگو! تم معاویہ کی امارت و اقتدار کو ناپسند مت کرو، کیونکہ اگر تم نے ان کو گم کردیا تو دیکھوگے کہ سر اپنے شانوں سے اس طرح کٹ کٹ کر گریں گے جس طرح حنظل کا پھل اپنے پودے سے گرتا ہے" (البدایہ والنہایہ 8/131)۔ اگر حضرت علی رض کا خیال ہوتا کہ حضرت معاویہ رض کا موقف خلاف اولی نہیں بلکہ بالکل غلط ہے تو وہ ان کی امارت کو پسندیدہ کیوں قرار دیتے؟ بنی اسرائیل کے گوسالہ پرستی کے معاملے میں بھی حضرت موسی علیہ السلام کا حضرت ہارون علیہ السلام سے اختلاف دراصل اولی اور خلاف اولی ہی کا تھا۔ حضرت موسی علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے اس موقف کو خلاف اولی سمجھا کہ گئوسالہ پرستی پر انہوں نے مجرموں کا فورا مواخذہ نہیں فرمایا تھا۔ حضرت موسی علیہ السلام یہ خیال کرتے تھے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کے اس خلاف اولی موقف سے امت

موسویہ کا نقصان ہوا ہے۔ اسی لئے غصے کے عالم میں انہوں نے حضرت ہارون پر سختی فرمائی لیکن حضرت ہارون علیہ السلام کی وضاحت پر وہ مطمئن ہوگئے۔ بعینہٖ اسی طرح حضرت علی رض یہ خیال فرماتے تھے کہ حضرت معاویہ رض کا خلاف اولی موقف پر اصرار امت محمدیہ کے مفاد میں نہیں ہے۔ اسی لئے انہوں نے حضرت معاویہ رض کے خلاف لشکر کشی فرمائی۔ اگر سیدنا حضرت علی رض کو سیدنا معاویہ رض سے بالمشافہ گفتگو کا موقع ملتا جیسے انہیں جنگ جمل سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ساتھیوں سے بالواسطہ اور پھر بلاواسطہ رابطے کا موقع ملا تھا اور باہم رنجش واختلاف دور ہو گیا تھا، اسی طرح حضرت معاویہ رض سے بھی ان کا اختلاف دور ہو جاتا۔ لیکن جس طرح جنگ جمل کے موقع پر سبائیوں پر مشتمل حقیقی ملعون اور خبیث اصل باغی ٹولے نے دھوکہ دہی سے جنگ چھیڑ دی، اسی طرح جنگ صفین سے پہلے کی فریقین کی پر خلوص مصالحانہ مساعی پر بھی اسی حقیقی اور باغی مفسد ٹولے نے پانی پھیر دیا اور اشتعال انگیزی پر قائم رہے۔ اللہ تعالی کی حکمت بالغہ کے تحت اس کا مفید اثر یہ ہوا کہ بالآخر جنگ برپا ہوئی جس میں ان ہی مفسدین کی بڑی تعداد اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئ اور جو فریقین میں سے مخلص لوگ مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے تو حضرت علی رض نے بجا طور پر ارشاد فرمایا کہ ہمارے اور ان کے مقتولین دونوں جنت میں ہیں۔ الغرض یہ جنگ درحقیقت امت مسلمہ کے لئے ایسے ہی مفید ثابت ہوئی جیسے حضرت عائشہ صدیقہ رض پر منافقین کی شرارت سے بہتان والا واقعہ بظاہر اذیت ناک ہونے کے باوجود اپنے نتائج کے اعتبار سے مفید ہی ثابت ہوا۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: -لا تحسبوہ شرا لکم بل ھو خیر لکم (النور 11)۔ "اس (واقعہ افک) کو تم اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے لئے اچھا ہے"۔ ان مباحث میں ابھی ہم نے اوپر سورہ حجرات کی جن دو آیات کا حوالہ دیا تھا تو دوسری آیت کے آخر میں اللہ تعالی کے دو اسمائے حسنی علیم اور حکیم لائے گئے ہیں۔ یعنی اگرچہ صحابہ کرام کو ایمان محبوب ہے اور وہ ان کے دلوں میں خوب مزین ہے اور اگرچہ ان کے لئے کفر، فسوق اور عصیان کو اللہ تعالی نے

ناپسندیدہ کر دیا ہے اور اگرچہ اللہ تعالیٰ کا ان پر خاص الخاص فضل و کرم اور احسان و امتنان ہے لیکن اس کے باوجود اگر کسی وقت ان میں باہم انتظامی امور میں اختلافات کی بناپر جنگ بھی ہو جائے تو اس میں بھی علیم و حکیم اللہ تعالیٰ کی حکمتیں مضمر ہوں گی۔ چنانچہ اگلی ہی آیات میں ہے کہ اگر مسلمانوں کی دو جماعتوں میں جنگ ہو جائے تو بھی وہ باہم بھائی بھائی ہی ہیں۔ تم اپنے بھائیوں میں صلح کرادیا کرو۔ علیم و حکیم اللہ تعالیٰ نے اپنے پیشگی علم اور حکمت بالغہ کے تحت صلح کرانے کا یہ عظیم شرف اپنے محبوب ترین بندے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ترین نواسے سیدنا حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا فرمایا۔ جو شروع ہی سے مسلمانوں کی باہم جنگ کو ناپسند فرمایا کرتے تھے اور یہ حکیمانہ قول بھی ان کی زبان پر جاری رہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نبوت و خلافت کو ایک ہی خاندان میں جمع نہیں کرے گا۔ ان جنگوں کے ذریعے مفسدین کی بڑی تعداد کو اللہ تعالیٰ نے کیفر کردار تک پہنچادیا۔ بچے کھچے مفسدین بھی بالآخر زیر زمین جانے اور پھر عرصہ دراز کے بعد نمودار ہونے پر مجبور ہوئے۔ ان مباحث سے یہ معلوم ہوا کہ مشاجرات صحابہ کرام میں بہترین موقف سکوت و توقف کا ہے یا حضرت علی رض کی پیروی میں حضرت معاویہ رض کے موقف کو خلاف اولی تو قرار دیا جاسکتا ہے غلط ہر گز نہیں۔ گو یہ دوسرا موقف صحابہ کرام کے بعد کے ادوار کے لوگوں کے لئے مرجوح اور خلاف اولی ہے کیونکہ ہم اپنے علم کے اعتبار سے مجہول العاقبہ اور صحابہ کرام رض معلوم العاقبہ ہیں۔ وماعلینا الا البلاغ

(انیسویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ان مباحث میں سورہ نور کی آیت استخلاف اور سورہ مائدہ کی آیت ارتداد کے حوالے سے بتایا جاچکا ہے کہ آیت استخلاف کے خاص الخاص موعود لھم اور کامل مصداق چاروں خلفائے راشدین ہیں اور آیت ارتداد میں جن لوگوں کو اللہ تعالی نے اپنا محبوب اور اللہ کو ان کا محبوب قرار دیا ہے اس سے خلیفہ اول سیدنا ابو بکر صدیق اور ان کی خلافت کے تحت فتنہ ارتداد کا استیصال کرنے والے مہاجرین، انصار اور مولفتہ القلوب صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) مراد ہیں۔اس سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض امامیہ کتب سے بھی متعلقہ اقتباسات ہدیہ ناظرین کئے جائیں۔

شیعہ مفسر علامہ فتح اللہ کاشانی اپنی تفسیر منہج الصادقین میں آیت استخلاف کے متعلق تحریر فرماتے ہیں؛- ودراندک فرصتے حق تعالی بوعدہ مومناں وفانمودہ جزائر عرب ودیار کسری و بلاد روم بدیشاں ارزانی داشت۔ " یعنی اللہ تعالی نے مومنوں سے اپنا وعدہ تھوڑے ہی عرصے میں پورا کردیا۔ عرب کے "جزائر، کسری کے علاقے اور روم کے شہر انہیں عطا فرمائے۔

شیعہ مفسر ابو علی طبرسی اپنی تفسیر مجمع البیان میں آیت استخلاف کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔ لیستخلفنہم والمعنی لیورثنہم ارض الکفار من العرب والعجم فیجعلہم سکانہا وملوکہا۔ " یعنی اللہ تعالی ان کو عرب وعجم کے کفار کے علاقوں کا ضرور بالضرور وارث بنائے گا پس وہ ان میں رہیں گے اور ان علاقوں کے بادشاہ ہوں گے۔

شیعہ مفسر علامہ محمد حسین طباطبائی اپنی تفسیر المیزان فی تفسیر القرآن میں آیت استخلاف کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں؛- انھا (آیت الاستخلاف) واردۃ فی اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وانجز اللہ وعدہ

لھم باستخلافھم فی الارض و تمکین دینھم و تبدیل خوفھم امنا بما اعزالاسلام بعد رحلۃ النبی فی ایام الخلفآء الراشدین والمراد باستخلافھم استخلاف الخلفآء الاربعۃ بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم او الثلاثۃ الاول منھم و نسبۃ الاستخلاف الی جمیعھم مع اختصاصہ ببعضھم وھم الاربعۃ او الثلاثۃ من قبیل نسبۃ امر البعض الی الکل کقولھم قتل بنو فلان۔" یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اللہ تعالی نے ان کے حق میں اپنا وعدہ یوں پورا فرمایا کہ انہیں زمین کی خلافت دی، ان کے دین کو استحکام بخشا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دیا، اس لئے کہ اس نے اسلام کو عزت بخشی۔ یہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں ہوا۔ استخلاف سے مراد خلفائے اربعہ کا یا خلفائے ثلاثہ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ بننا ہے۔ تمام (اصحاب) کی طرف خلافت کی نسبت باوجود اس کے کہ خلفاء تو چار یا تین تھے (جو آیت استخلاف کا مصداق ہوئے) اس طرح ہے جیسے بعض لوگوں کے معاملے کو کل یعنی پوری جماعت کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں قوم نے قتل کیا۔ (حالانکہ سب لوگ قتل نہیں کرتے)"

غزوہ روم کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے سیدنا حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے مشورہ کیا تھا کہ میں بذات خود اس میں شریک ہونا چاہتا ہوں تو نہج البلاغہ کی عبارت کے مطابق حضرت علی رض کے تفصیلی جواب کا ایک حصہ یہ بھی تھا.. قد توکل اللہ لاھل ھذاالدین باعزاز الحوذہ وستر العورہ۔" یعنی بیشک اللہ اس دین اسلام والوں کے لئے وکیل اور کارساز ہو گیا ہے کہ وہ ان کی جماعت کو غالب کرے گا اور ان کی کمزوریوں کو چھپائے گا"۔

نہج البلاغہ کے شارح شیعہ عالم ابن میثم بحرانی حضرت علی رض کے مذکورہ قول کے متعلق فرماتے ہیں وھذا الحکم من قولہ تعالی وعد اللہ الذین آمنوا منکم و عملواالصالحات الآیہ۔" حضرت علی رض نے یہ مضمون اللہ تعالی کے قول وعد اللہ الذین الخ یعنی آیت استخلاف سے لیا ہے" چونکہ آیت استخلاف میں بشارت اور

وعدہ نزول آیت کے وقت کے مومنین کاملین اور صالح وپرہیزگار لوگوں سے کیا گیا تھا جس کا مصداق خلفائے راشدین بدرجہ اولی ثابت ہوئے تو اس سے ان کی خلافت کی حقانیت اور ان کا ایمان اور اعمال صالحہ کی نعمت سے علی وجہ الکمال بہرہ مند ہونا بھی ثابت ہوا۔ اور ان غیبی خبروں کے ٹھیک ٹھیک پورا ہونے سے قرآن کریم کا معجزہ ہونا بھی واضح ہوا۔ پس خلفائے راشدین کی طرف جن عیوب اور مطاعن کی نسبت کی جاتی ہے وہ از خود کالعدم ہوگئے کہ ان خلفائے راشدین کے ایمان اور اعمال صالحہ کی شہادت خود اللہ تعالی نے دی ہے۔ بلکہ نزول آیت کے وقت کے سب صحابہ کرام کے متعلق شہادت دی ہے۔

غزوہ خندق کے سلسلے میں ملا باقر مجلسی نے حیات القلوب میں لکھا ہے۔:۔پس فرمودہ کہ در برق اول قصرہائے یمن را دیدم وخدا آں را بمن داد و در برق دوم قصرہائے شام را دیدم وخدا آں را بمن داد و در برق سوم قصرہائے مدائن را دیدم وملک شاہاں عجم را بمن داد پس خدا فرستادہ کہ لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون۔" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا کہ (غزوہ خندق میں ایک چٹانی پتھر کو ضرب لگانے پر جو تین مرتبہ روشنی ہوئی تھی تو) پہلی چمک میں میں نے یمن کے محلات دیکھے اور خدا نے وہ مجھے دے دیئے۔ دوسری روشنی میں میں نے شام کے محلات دیکھے اور خدا نے وہ مجھے دے دیئے۔اور تیسری روشنی میں میں نے مدائن کے محلات دیکھے تو عجم کے بادشاہوں کا ملک مجھے دے دیا۔ پس خدا نے یہ آیت بھیجی۔" تاکہ وہ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کردے اگرچہ مشرکوں کو یہ ناپسند ہو۔"

ظاہر ہے کہ یہ سب فتوحات خلفائے راشدین کے دور میں انہی کے ذریعہ ہوئی تھیں۔ لہٰذا قطعیت سے یہ ثابت ہوگیا کہ مذکورہ آیت کا مصداق خلفائے راشدین رض اور ان کے توسط سے تمام صحابہ کرام ہیں۔

آیت ارتداد کی تفسیر میں مشہور شیعہ مفسر علامہ کاشانی نے اپنی تفسیر منہج الصادقین میں جو کچھ لکھا ہے
-:اس کے ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں

1 - در تاریخ مذکور است کہ سیزدہ قبائل از اسلام مرتد شدند۔ سہ در آخر عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم
...... وقتل اسود در شبے واقع شد کہ در صبح آں رسول خدا صلعم بجوار رحمت ایزدی پیوست

2- وبعد ازاں رسول خدا بیمار شد و بجوار ایزدی پیوست وکار مسیلمہ قوت گرفت و ابوبکر چوں بخلافت
....بنشست خالد بن ولید را با جماعتے بجانب خیبر فرستادتا اورا مقہور کردند

3- در عہد ابوبکر ہفت قبیلہ مرتد شد... حق تعالی شر ایشاں را کفایت کرد بردست مسلماں بقتل آمدند... در زمانہ عمر رض غسان قوم جبلہ بن ایہم نصرانی شدہ... نقل کردہ اند کہ آیت در بارہ ابوبکر و اصحاب او است کہ با اہل ردہ کارزار کردند۔

1- تاریخ میں مذکور ہے کہ اسلام میں تیرہ قبیلے مرتد ہوئے جن میں سے تین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانے میں ہوئے...اور اسود عنسی کا قتل اس رات کو واقع ہوا جس کی صبح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا۔

2- اور اس کے بعد رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) بیمار ہوگئے اور انتقال فرماگئے۔ مسیلمہ نے قوت پکڑ لی۔ جب ابوبکر رض خلیفہ ہوئے تو آپ نے خالد بن ولید رض کو ایک جماعت کے ساتھ خیبر کی جانب بھیجا یہاں تک کہ انہوں نے مسیلمہ کو مغلوب کر دیا۔

3- ابوبکر رض کے دور میں سات قبیلے مرتد ہوئے.... اللہ تعالی نے ان کے شر کو دور فرمایا اور یہ لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں مقتول ہوئے.... عمر رض کے زمانے میں جبلہ بن ایہم کی قوم غسان نصرانی ہو گئی.... (مفسرین و مورخین) بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت ابوبکر رض اور آپ کے ساتھیوں کے بارے میں ہے کہ انہوں نے مرتدین کے خلاف جنگ لڑی تھی"۔

مذکورہ بالا وضاحتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث حوض کا مصداق یہی مرتدین ہیں جن کی خبر قرآن کریم میں آئی اور جن کے خلاف حضرت ابوبکر صدیق رض اور دیگر صحابہ کرام نے جہاد کیا

(بیسویں قسط)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی تعدیل اور ان کے خلاف جھوٹے مطاعن و مثالب کی مدلل تردید ہمارا شرعی فریضہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے اور آپ نے اپنے دست مبارک سے کسی کو بسم اللہ تک بھی لکھ کر نہیں دی۔ سارا قرآن آپ نے کاتبین صحابہ کرام سے لکھوایا۔ فرامین و احکام، معاہدات اور حکمرانوں کو دعوتی خطوط وغیرہ بھی آپ نے اپنے اصحاب سے ہی لکھوائے۔ فتح مکہ کے بعد ان کاتبین میں آپ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی شامل فرمالیا، تاکہ فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے اہل مکہ پر بھی آنے والی نسلیں بھرپور اعتماد قائم رکھیں۔ صحابہ کرام سے اعتماد اٹھ جائے تو قرآن کریم سے بلکہ پورے دین سے ہی اعتماد اٹھ جاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہی (معاذاللہ ثم معاذاللہ) عبث اور بیکار قرار پاتی ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خاتم النبیین ہیں دین کی حفاظت اور اسے آئندہ نسلوں تک پہنچانے کی بھرپور ذمہ داری انہی صحابہ کرام ہی کی تھی جسے انہوں نے علی وجہ الکمال پورا کیا۔ دشمنان صحابہ کی شروع سے ہی یہ کوشش رہی کہ صحابہ کرام کو (معاذاللہ) فاسق و فاجر اور خائن تو کیا سرے سے ان کے ایمان ہی کو مشتبہ قرار دیا جائے تاکہ قرآن کریم کو

(معاذاللہ ثم معاذاللہ) محرف قرار دینے کی ان کی ناپاک مساعی کے لئے راہ ہموار ہوسکے۔ قرآن کریم میں ہے؛-انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون۔ "کہ ہم نے ہی اس نصیحت (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔ قرآن کریم تبھی کتاب نصیحت ہوسکتا ہے جبکہ نہ صرف اس کے کلمات محفوظ ہوں بلکہ اس کے مجملات کی وضاحت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی، فعلی اور تقریری سنت نہ صرف احادیث صحیحہ کی صورت میں آئندہ نسلوں تک منتقل ہو بلکہ اس کا بہت بڑا حصہ تعامل امت

کے یقینی ذریعے سے بھی لوگوں تک پہنچے۔ صحابہ کرام کے بعد کے حکمران خواہ بذات خود اچھے ہوں یا نہ ہوں اس سے وہ اسباب ہرگز خلل پذیر نہیں ہوئے جن کے تحت اللہ تعالی نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی اپنے وعدے کے مطابق خود حفاظت فرمائی، کیونکہ اللہ تعالی نے جہاں قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرمایا تو یہ بھی ارشاد فرمایا:- ثم ان علینا بیانہ "کہ اس کی تشریح وتوضیح یعنی بیان قرآن بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔ اسی بیان قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت مبارکہ اور اپنے اسوہ حسنہ سے صحابہ کرام کے ذریعہ امت تک پہنچایا۔ پس یزید بن معاویہ اور بعد کے حکمران اپنے اعمال وافعال اور گفتار و کردار کے لحاظ سے اچھے ہوں یا نہ ہوں، ان سے دین کا کوئی حقیقی مفاد یا ضرر وابستہ نہ رہا، ورنہ قرآن اور بیان قرآن کی حفاظت وسالمیت کے ربانی وعدے کو (معاذاللہ ثم معاذاللہ) جھٹلانا ہوگا۔ ان مباحث میں برادران یوسف کا ذکر بھی متعدد بار ہوا ہے۔ جن کے حسن عاقبت کی خبر قرآن کریم نے دی ہے لہذا ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ حالانکہ قرآن کریم سے ہی معلوم ہو رہا ہے کہ وہ سالہاسال تک حق اخوت، ابوت اور نبوت سبھی کو بری طرح پامال کرنے کے کبیرہ گناہوں میں مبتلا رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تحریر وتقریر اور عام بول چال میں برادران یوسف مثلا یہودا بن یعقوب کے نام کے ساتھ "حضرت" کا سابقہ اور "رضی اللہ عنہ" کا لاحقہ وغیرہ نہیں لگایا جاتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر غیر معصوم فرد یا افراد کے حسن عاقبت کی یقینی خبر دی بھی جاچکی ہو تو اس فرد یا افراد سے فسق وفجور کا صدور بلکہ کبائر پر سالہاسال کے لئے اصرار عقلا وشرعا محال نہیں۔ اس کے باوجود ان کی حسن عاقبت متاثر نہیں ہوگی اور وہ بالاخر قولا وعملا صراط مستقیم پر ہی آکر رہیں گے۔ پس اگر غزوہ قسطنطنیہ والی حدیث اور متعلقہ تاریخی جزئیات کے مطابق یزید واقعی بشارت مغفرت کے موعود لہم لوگوں میں شامل ہو تو اس کے حقیقی یا مفروضہ فسق وفجور کو برادران یوسف کے کارناموں پر قیاس کرنے میں کون سا امر مانع ہے؟ الغرض جو حضرات یزید کی تعدیل کرتے ہیں تو برادران یوسف کے برعکس یزید

وغیرہ کے حسن عاقبت کی خبر قرآن کریم سے تو نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں بعض احادیث اور تاریخی روایات پر ہی انحصار کرنا پڑے گا۔ اس کے باوجود اگر برادران یوسف کے ناموں کے ساتھ "حضرت" اور "رضی اللہ عنہ" سابقہ یا لاحقہ نہ لگانے سے ان کی حیثیت مجروح نہیں ہوتی تو اگر یزید وغیرہ کے ناموں کے ساتھ بھی اسی طرح کے سابقے اور لاحقے نہ لگائے جائیں تو اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ اس لئے بھی ہونا چاہیئے کہ ایسا کرنے سے مخالفین شعوری یا غیر شعوری طور پر سیدنا معاویہ رض وغیرہ کی شان میں تفریط کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یزید وغیرہ کو (دور حاضر میں خصوصا) خبیث، پلید اور لعین وغیرہ قرار دینا بھی اس لئے صحیح نہیں کہ اگر وہ واقعی برا ہے تو قرآن کریم میں تو مشرکین کے معبودان باطلہ کو بھی برا بھلا کہنے سے ہمیں اس لئے روکا گیا ہے کہ اس کے جواب میں مشرکین بھی (معاذاللہ ثم معاذاللہ) اللہ تعالی پر بھی سب وشتم کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو یزید سے شدید محبت ہے خواہ وہ اس میں حق بجانب ہیں یا نہیں تو یزید کی تفسیق پر ان کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ وہ سیدنا حضرت علی اور حضرات حسنین (رضی اللہ عنہم) کے حق میں شعوری یا غیر شعوری طور پر تفریط پر اتر آتے ہیں۔ فرقہ بندیوں کی فضا کو مزید مسموم ہونے سے بچانے کے لئے ہمیں امام ابن تیمیہ رح وغیرہ جیسے اکابر کی راہ اعتدال اختیار کرنی چاہیئے۔ بے مقصد بلکہ مضر محاذ آرائی سے بچنے کے لئے یہی کہنا کافی، شافی اور وافی ہے کہ صحابہ کرام اور اہل بیت کے دشمنوں کو اور سیدنا عثمان اور سیدنا حسین (رضی اللہ عنہما) کے قاتلین کو اگر موت سے پہلے توبہ کی توفیق حاصل نہ ہوئی ہو یا اللہ تعالی نے انہیں کسی بھی وجہ سے معاف نہ فرمایا ہو تو ان سب پر اللہ کی لعنت ہو۔ یعنی لعنت سے کوئی باز نہ رہ سکے تو اس میں تعمیم ہی سلامتی کی راہ ہے۔ متنازعہ شخصیات کی نام بنام تعیین و تخصیص چونکہ بعض لوگوں کے لئے اشتعال انگیز ہو سکتی ہے لہذا قرآن کریم سے بھی اس کی ممانعت ثابت ہوتی ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا۔ نیز ارشاد ہے:- تلک امہ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عن ماکانوا یعملون (البقرہ 141)۔" یہ

ایک جماعت ہے جو گزر چکی، ان کے اعمال ان کے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں اور تم سے ان کے متعلق پوچھا نہیں جائے گا۔" الغرض دینی نقطہ نگاہ سے یزید وغیرہ کی تعدیل و تفسیق قطعاً غیر ضروری ہے تاہم تاریخی نقطہ نگاہ سے کسی بھی متنازعہ شخصیت کے ساتھ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے حق میں اور اس کے خلاف تمام روایات بغیر کسی کمی بیشی کے قارئین کے سامنے رکھی جائیں اور راویوں کی درجہ بندی کی جائے اور جن روایات سے صحابہ کرام اور ان کی اولادوں کی من حیث المجموع سخت توہین و تنقیص ہورہی ہو تو قرآنی ہدایت کے مطابق فوراً یہ کہنا چاہئیے :- ھذاافک مبین

(النور 12)۔ " یہ تو صریح بہتان اور جھوٹ ہے"۔ مثلاً بنوامیہ کے دور حکومت میں سینکڑوں فتوحات ہوئیں۔ غیر مسلموں کے بہت سے علاقے مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔ امویوں نے اندلس (اسپین) میں بھی شاندار حکومت قائم کی۔ کیا کوئی ایسا تاریخی جزئیہ موجود ہے کہ غیر مسلموں نے امویوں پر یا دیگر مسلمان فاتحین پر یہ الزام عائد کیا ہو کہ انہوں نے ہماری ہزاروں خواتین کو حاملہ کردیا تھا؟ تو واقعہ حرہ میں مدینہ منورہ کی ایک ہزار خواتین کے ناجائز حاملہ ہونیکی روایات جن شیاطین نے گھڑیں انہوں نے مردم شماری بھی کرڈالی کہ ان خواتین کی تعداد ایک ہزار تھی۔ اگر ہمارے قدیم مورخین نے جھوٹے راویوں کی ایسی روایات کو بلا تنقید و تبصرہ نقل کیا ہے تو انہوں نے اکثر و بیشتر صورتوں میں راویوں کے نام بھی لکھ دیئے تاکہ ماہرین رجال صحیح اور غلط میں امتیاز کرتے ہوئے لوگوں کی صحیح رہنمائی کرسکیں۔ واللہ یھدی من یشآء الی صراط مستقیم۔